Regd. L. No. 7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1974

ہماری آزادی اور غلامی کا معیار

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کیلئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔ (قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

شائع کردہ : ادارہ طلوعِ اسلام — ۲۵ بی — گلبرگ — لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ ۔ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہ نامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ
پاکستان سالانہ ــــ ۱۵ روپے غیر ممالک سالانہ ــــ ½ ۱ پونڈ	۸۰۸۰۰ خط وکتابت ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی گلبرگ ۲ - لاہور	(½ ۱) ڈیڑھ روپیہ

جلد ۲۷	جون ۱۹۷۴ء	نمبر ۶

فہرست

(۱) لمعات ــــــــــــ ۲
(۲) حقائق وعبر ــــــــــــ ۱۰
(۳) باب المراسلات ــــــــــــ ۱۴
(۴) سابق صدر) ایوب کی یاد میں ــــــــــــ ۱۷
(۵) مزدوروں کا مسئلہ ــــــــــــ ۱۴
(۶) بہ غولِ بیابانی ــــــــــــ ۴۶
(۷) شاہکارِ رسالتؐ ــــــــ محترم آغا شورش کاشمیری - ۴۹
(۸) من ویزداں ــــــــــــ ۵۴
(۹) مجلس مذاکرہ (طلوع اسلام کنونشن ۱۹۷۳ء) ــــــــــــ ۵۵
(۱۰) گذارشِ احوالِ واقعی ــــــــــــ ۶۴

ایڈیٹر [illegible] ناشر [illegible]

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

گذشتہ ماہ دو ایک واقعات ایسے گذرے ہیں جو ہمارے نقطۂ نگاہ سے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اپریل کے آخری عشرہ میں اقوام متحدہ کی، جنرل اسمبلی کا ایک خاص اجلاس اسی غرض سے منعقد ہوا کہ وہ اقوام عالم کی اقتصادی حالت کا جائزہ لے اور یہ دیکھے کہ ترقی پذیر ممالک کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے کیا تجاویز اختیار کی جا سکتی ہیں۔ یہ اجلاس اس اعتبار سے بھی اہمیت بدوش تھا کہ اس ادارہ کی تاریخ میں، اس قسم کا اجتماع پہلی بار منعقد ہوا تھا۔ اس میں پاکستان کی نمائندگی وفاقی وزیر خزانہ، ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کے حصے میں آئی تھی۔ اُس میں اُن کی تقریر بڑی جامع اور مانع تھی جسے دُنیا کے مختلف گوشوں میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ مختلف مقررین نے اس بات کا رونا رویا کہ دنیا کی حالت بڑی ابتر ہوتی جا رہی ہے اور اس کی اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس مقام پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ——

اس اجتماع میں جو مسئلہ زیر بحث ہے اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے، وہ پس منظر ایک طول طویل کش مکش کی تاریخ ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں ترقی پذیر ممالک نے اپنی سیاسی آزادی کے حصول کے لئے بڑی کامیاب جدوجہد کی۔ اب وہ اپنی معاشی آزادی کے لئے مصروف تگ و تاز ہیں۔ کیا یہ امر فطری نہیں کہ یہ کش مکش اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک تمام کرۂ ارض پر امن اور نوع انسان کی باہمی خیر سگالی کی فضا قائم نہیں ہو جاتی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ تاریخ کی مسخ کردہ تعبیر نہیں۔ جہاں تک اسلامی جمہوریہ پاکستان کا تعلق ہے ہمارے لئے یہ حقیقت ارشادِ خداوندی پر مبنی ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

انسانوں کے اعمال کی وجہ سے خشکی اور تری میں عالمگیر فساد رونما ہو گیا تاکہ خدا انہیں ان کے تباہ کن اعمال کے نتائج کا مزہ

چکھا دے۔ تاکہ شاید وہ اس طرح اپنی غلط روش سے باز آجائیں (۳۰/۴۱)

اُس نے دوسرے مقام پر کہا ہے :

اگر خدا انسانوں کو بعض جماعتوں کے ہاتھوں دوسری جماعتوں (کے ظلم و تعدّی) کی مدافعت نہ کراتا رہے تو زمین میں فساد ہی فساد برپا ہو جائے (۲/۲۵۱)

جہاں تک معاشی مسئلہ کا تعلق ہے - ڈاکٹر صاحب نے فرمایا :

میرا مذہب —— اسلام —— اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ خدا نے تمام مخلوق کے لئے رزق پیدا کیا ہے اور زمین کے ذخائر تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں کھلے رہنے چاہئیں۔ قرآن کے الفاظ میں :

اللہ وہ ہے جس نے زمینی ذخائر کو تم سب کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے (۲/۲۹)

دوسری جگہ ہے :

کیا تم اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے خدا نے اُسے تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر رکھا ہے اور تمہیں ظاہر و باطن کی نعمتیں بھرپور عطا کی ہیں۔ (۳۱/۲۰)

اس کے بعد اُنہوں نے کہا :

یہ ہمارا گہرا عقیدہ ہے کہ زمین، سمندر اور فضا کے تمام ذخائر تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے مفاد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، نہ کہ کسی ایک نسل کے لئے - یہ اُن کے عارضی۔ مالکوں کے خصوصی مفاد کے لئے نہیں، اسلام کا یہ بھی اعلان ہے کہ افراد یا اقوام جو نظر بظاہر دولت، یا کسی اور شے کی مالک ہیں وہ درحقیقت ان کی مالک نہیں، امین ہیں۔ وہ انہیں صرف اپنی ضروریات کی حد تک اپنے صرف میں لا سکتے ہیں۔ انہیں اس کی قطعاً اجازت نہیں کہ وہ اس مال و دولت کو ضائع کریں یا دوسروں کے حصے کو غصب کر کے لے جائیں اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ خدا کے الم انگیز عذاب کے متوجب ہوں گے۔

(پاکستان ٹائمز ۲۴/۴/۷۴)

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سائنٹیفک سوشلزم کے داعی ہیں۔ یوں تو سوشلزم بذاتہٖ اسلام کی نقیض ہے لیکن اس کے سائنٹیفک برانڈ کے متعلق تو یوں سمجھئے جیسے وہ سہ آتشہ ہو۔ وہ مارکسی سوشلزم کی خالص شکل ہے۔ جس میں خدا، رسول، وحی، معاد جیسے عقاید کا یکسر انکار کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر صاحب کی زبان سے اقوام متحدہ

جیسے ادارہ کے عالمگیر اجتماع میں قرآن کی آیات کا پیش کیا جانا، بڑا تجربہ انگیز اور (ہمارے لئے) مسرت خیز واقعہ ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب واقعی سائینٹیفک سوشلزم کے حامی ہیں تو اُن میں یہ انقلاب بڑا ہی مبارک اور مسعود انقلاب ہے۔

ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض اشتراکی، قرآن کی اُن آیات کو اپنے دعاوی کی تائید میں پیش کر دیتے ہیں، جو اُن کے معاشی نظام کے مؤید ہوں۔ وہ اُن آیات کے منزل من اللہ ہونے کے قائل نہیں ہوتے، صرف مسلمانوں کو اس بات کا قائل کرنے کے لئے کہ اشتراکیت، اسلام کی نقیض نہیں، ان آیات کو، رسپر کے طور پر، سامنے لے آتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ کیفیت نہیں ہوگی اور اسی اُمید پر ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں عرض کریں گے کہ معاشی نظام کے متعلق قرآن کریم میں یہی دو تین آیات نہیں ہیں۔ اُس میں پورا نظام دیا ہوا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ اُس نے وہ اساس بھی بہم پہنچائی ہے جس پر اس قسم کے انقلابی نظام کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ یہ بنیاد قرآن کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتی۔ بنا بریں، اگر ہمیں کہیں قرآن کا حوالہ دینا ہو تو اس کی اس منفرد خصوصیت کو بھی سامنے لانا چاہیئے۔

جب ڈاکٹر صاحب اُس اجتماع میں یہ آیات پیش کر رہے تھے تو ہمیں ایک خطرہ لاحق ہوا تھا غنیمت ہے کہ وہ ٹل گیا۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کے لئے بہت بڑی مشکل کا سامنا ہو جاتا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جہاں تک اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کا تعلق ہے ہمیں قرآن رہنمائی دیتا ہے اور قرآن کریم کی رُو سے وسائل پیداوار کسی شخص یا قوم کی ملکیت میں نہیں رہ سکتے، اُنہیں تمام انسانوں کی ضروریات کے مطابق یکساں کھلا رہنا چاہیئے۔ خطرہ ہمیں یہ تھا کہ اگر سامعین میں سے کوئی یہ پوچھ بیٹھتا کہ جب آپ کی مملکت قرآنی احکام کی پابند ہے اور وسائل پیداوار کے سلسلے میں قرآن کا حکم یہ ہے۔ تو پھر آپ کے ہاں اس پر عمل کیوں نہیں ہو رہا، تو ڈاکٹر صاحب اس کا کیا جواب دیتے، ہمارے ذمہ دار اربابِ حکومت کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ کہیں قرآن یا اسلام کا نام لیں تو اس قسم کے سوالات کا سامنا کرنے کے لئے بھی تیار رہا کریں۔ اپنے ملک میں تو اس لئے خیریت رہتی ہے کہ کوئی کچھ پوچھے، یہ حضرات اپنے آپ کو اس کی جواب دہی کے مکلف نہیں سمجھتے، لیکن اس قسم کے بین الاقوامی اسٹیج پر تو ایسے سوالات کا جواب دینا ہی پڑتا ہے۔

دوسرا قابل ذکر واقعہ ہمارے محترم وزیر اعظم مسٹر بھٹو کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے شروع مئی میں ڈیرہ اسمٰعیل خان میں گومل یونیورسٹی کے سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب پر ارشاد فرمائی۔ انہوں نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے سپاس نامہ کے جواب میں فرمایا:

> آپ نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کی اس شدید آرزو کا ذکر کیا ہے جس کی رُو سے انہوں نے اپنے لئے ایک آزاد، مسکن کا مطالبہ کیا تھا اور اس کے لئے اس قدر صعوبات برداشت کیں اور قربانیاں دی تھیں۔ نظریۂ پاکستان، اسلامی اخوت و مساوات کی بلند اقدار سے معمور ہے۔

آپ نے صحیح کہا ہے کہ اسلام معاشرتی عدل کا سختی سے حکم دیتا ہے اور کسی کے کسی حق کو تسلیم نہیں کرتا تاوقتیکہ وہ اُن ذمہ داریوں کو پورا نہ کرے جو خدا اور دوسرے انسانوں کی طرف سے اس پر عاید ہوتی ہیں۔ یہ نسل، قبیلہ یا ذات برادری کے امتیاز کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر ہم اس اصول کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنالیں تو ہماری بہت سی مشکلات خود بخود ختم ہو جائیں۔ اسلام میں نسلی تعصبات، صوبائی امتیازات، یا دیگر کسی قسم کے تفرقہ انگیز رجحان کی قطعاً گنجائش نہیں۔

یہ امر میرے لئے موجب مسرت ہے کہ اسلامیات کے مضمون کو دسویں جماعت تک لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ (لیکن اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ) اسلامیات ہمارے نصاب تعلیم میں ایک الگ تھلگ مضمون بن کر نہ رہ جائے۔ اسے ہمارے نظام تعلیم میں تانے بانے کی حیثیت اختیار کرنی چاہیئے۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ذریعے اسلامی تعلیم کا جو نیا طریق رائج کیا جا رہا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی تعلیم کو ایسے انداز میں پیش کیا جائے جو ہماری نئی نسل کے لئے دلکش اور جاذب ہو اور اس طرح وہ ایک ایسا قالب بن جائے جس میں اُن کی شخصیت ڈھل جائے۔ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ ہمارے نوجوان اپنے ثقافتی ورثہ اور تحریک پاکستان کو نہ بھلا دیں۔ اس مقصد کے لئے میں نصاب تعلیم میں اس قسم کی تبدیلی کو خوش آمدید کہوں گا جس میں تحریک پاکستان کو نمایاں کیا گیا ہو اور حصولِ پاکستان کی کشمکش میں علامہ اقبالؒ، قائداعظمؒ اور ہمارے دیگر قومی زعماء نے جو خدمات سرانجام دی تھیں اُنہیں اُجاگر کیا جائے۔ پاکستان کے بنیادی نظریہ کا تحفظ، فروغ اور تعمیل ہمارے نظام تعلیم کا اولین مقصد ہونا چاہیئے۔ تاکہ یہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا حقیقی پس منظر بن جائے۔ پاکستان سٹڈیز کا شعبہ، جو مختلف یونیورسٹیوں میں کھولا گیا ہے اور نیشنل انسٹیٹیوٹ آف پاکستان، جسے اسلام آباد یونیورسٹی میں قائم کیا گیا ہے، اس باب میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ (پاکستان ٹائمز ۳/۵/۷۴)

ہم سمجھتے ہیں، اور ہمارے قارئین ہم سے متفق ہوں گے کہ ان خیالات پر مسٹر بھٹو کو جس قدر مستحق مبارکباد بھی قرار دیا جائے، بجا ہوگا۔ اگر ہماری تعلیم کے نظریہ اور نصاب میں اس قسم کی تبدیلی آجائے تو ملک اُس خطرہ سے محفوظ ہو جائے گا جس کی نشان دہی ہم نے چند صفحات آگے چل کر اس مختصر مضمون میں کی ہے جس کا عنوان ہے "یہ غولِ بیابانی"

لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ خطرہ اس قسم کے مقدس خیالات کے اظہار سے ٹل نہیں سکتا۔ خیالات کوئی تعویذ نہیں ہوتے جن کے لٹکا دینے سے خطرات خود بخود ٹل جاتے ہیں۔ یہ اُسی صورت میں ثمر بار اور نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں جب اُنہیں عمل میں لایا جائے۔ ہم، آپ، اگر اپنے خیالات کے اظہار تک محدود رہتے ہیں تو اس میں ہم معذور ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس نہ وہ اختیارات ہوتے ہیں جن کی رُو سے ہم اپنے خیالات کو ملک میں قانونی حیثیت سے نافذ کر سکیں۔ اور نہ ہی وہ

وسائل جن کے ذریعے انہیں بروئے کار لایا جا سکے۔لیکن مملکت کے سربراہ کے راستے میں تو کوئی دشواری حائل نہیں ہوتی۔وہ اپنے خیالات کو قانونی حیثیت سے نافذ بھی کر سکتا ہے اور اُس کی تحویل میں ایسے ذرائع و وسائل بھی ہوتے ہیں جن کی رُو سے وہ انہیں عملی شکل بھی دے سکتا ہے۔ہم محترم وزیر اعظم کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ تعلیم کا مسئلہ مُلک کے تحفظ، استحکام، فروغ اور مستقبل کیلئے بنیادی مسئلہ ہے۔وہ اولین کوشش کریں کہ ان کے یہ خیالات ملک میں عملی شکل اختیار کر لیں۔

جہاں تک "اسلامیات" کا تعلق ہے ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ نہ صرف یہ کہ اس سے ہماری نئی نسل کے قلب و دماغ میں کوئی صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہوتی بلکہ، اس کے برعکس، ہمارے طلباء میں جو اس وقت عام انتشار برپا ہے اس کی ایک بڑی وجہ اسلامیات کا مضمون ہے۔بظاہر یہ چیز بڑی تعجب انگیز اور ناقابلِ قبول سی نظر آئے گی کہ اسلامیات کا مضمون طلباء کے پیدا کردہ انتشار کا باعث ہے۔لیکن ہے یہ حقیقت۔طلباء کی فوج کو اپنے حیطۂ اقتدار میں رکھنا جماعت اسلامی کے بنیادی منصوبوں میں سے تھا اور سکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کے مضمون کی ترویج اس منصوبے کی اولین شاخ تھی۔ظاہر ہے کہ جب آپ درسگاہوں میں ایک مضمون کو رائج کریں گے تو آپ کو اُس مضمون کے پڑھانے والوں کی ضرورت بھی لاحق ہو گی۔اس جماعت نے اپنے اس منصوبے کے مطابق، اپنے ہم خیال طلباء کو ایم۔اے اسلامیات میں داخل کرایا۔اس مضمون میں کامیابی ایک طے شدہ امر تھا۔اس میں داخلہ لے لینا کامیابی کی کلید تھا۔آپ یونیورسٹی کے امتحانات کے نتائج کے گوشوارے نکال کر دیکھئے۔دیگر مضامین میں اگر نتائج کا تناسب تیس چالیس فی صد رہتا ہے تو اسلامیات میں نوّے، پچانوے فی صد تک جا پہنچتا ہے۔اس طرح جماعت اسلامی کے یہ متفقین "ایم اے اسلامیات" کر کے کھیپ در کھیپ سکولوں اور کالجوں میں پہنچنا شروع ہو گئے۔انہوں نے وہاں اس جماعت کے پراپیگنڈے کے (CELL) قائم کر لئے اور طلباء کے ذہنوں کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔یہ جو آپ گزشتہ دس پندرہ سال میں "اسلامی طلباء" کے جیوش و عساکر دیکھ رہے ہیں، یہ اسلامیات کے اسی مضمون کے تیار کردہ ہیں۔اسلام کے متعلق ان کا مبلغ علم چند فقہی یا تاریخی معلومات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا، اور معلومات بھی وہ جو جماعت اسلامی کا لٹریچر بہم پہنچاتا ہے۔لیکن وہ اس جماعت کے پراپیگنڈہ کرنے کی مشینری کے کل پُرزے اور اس کے مقاصد کے بروئے کار لانے کے ذرائع ہوتے ہیں۔بنا بریں اس مضمون کو جتنی جلدی ختم کر دیا جائے۔قوم کے حق میں اتنا ہی بہتر ہو گا۔اس کے بجائے طریق تعلیم ایسا ہونا چاہئے کہ طلباء کوئی مضمون بھی پڑھیں ـــــ تاریخ، فلسفہ، معاشیات، فزکس، کیمسٹری، فلکیات وغیرہ ـــــ انہیں جہاں یہ معلوم ہو کہ ان شعبوں میں علم انسانی کہاں تک پہنچا ہے، اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ قرآن کریم اس باب میں ان کے متعلق کیا کہتا ہے اور وہ کیا طریق بتاتا ہے جس کی رو سے ان علوم کے ماحصل کو افراد کی ذات کی نشوونما اور نوعِ انسانی کی منفعت عامہ کے لئے اقدارِ خداوندی کے تابع صرف یا استعمال کیا جائے۔اس سے ان طالب علموں کے سامنے صحیح اسلام بھی آجائے گا اور خود ان کا قلب و دماغ بھی اقدارِ خداوندی کے سانچوں میں ڈھل جائے گا۔اس

کے بعد وہ کسی طالع آزما فرد یا گروہ کے آلۂ کار نہیں بن سکیں گے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے نظام تعلیم کو صحیح بنیادوں پر استوار کیا جا سکتا ہے۔

تیسرا قابل ذکر واقعہ وہ انٹرویو ہے جو شروع مئی میں نیویارک ٹائمز کے مینجنگ ایڈیٹر، مسٹر اے۔ ایم روزنتھل کو وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے دیا۔ وہ انٹرویو بڑا تفصیلی تھا اور مختلف اہم گوشوں کو محیط۔ ہم اُن میں سے صرف وہ دو چار سوالات لیتے ہیں، جو ہمارے نقطۂ نگاہ سے سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ہیں۔

سوال: کیا آپ کا خیال ہے کہ مسلمانانِ عالم کے ایک قوم بننے کے لئے صرف مذہب، کافی مضبوط رشتہ بن سکتا ہے؟

آپ نے غور کیا کہ سوال کیسا اہم اور بنیادی ہے اور اس شخص نے مسلمانوں کی کیسی دُکھتی ہوئی رگ کو پکڑا ہے۔ مسٹر بھٹو نے جو جواب دیا ہم اس پر تبصرہ آخر میں کریں گے۔ پہلے ان کا جواب اور مزید سوالات ملاحظہ فرمالیجئے۔

جواب: مذہب کے وسیع، ثقافتی نقطۂ نگاہ سے ایسا ممکن ہے ..... مشرق میں مذہب ایک ہمہ گیر، ثقافتی جذبہ پیدا کرتا ہے۔ بظاہر ایک شخص مذہبی آدمی نہ بھی ہو۔ وہ مذہبی شعائر کا بھی پابند نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود مذہب ایک ایسا طریقِ زندگی ہے جس سے ایک ایسا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو ایک شخص کی ساری معاشرتی زندگی کو متاثر کر دیتا ہے۔

سوال: لیکن تاریخ اس حقیقت کو جھٹلاتی ہے؟ عیسائیت اور یہودیت اس کی نمایاں مثالیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ ہم مذہب اقوام نے کس طرح ایک دوسرے کے خلاف لڑائیاں لڑیں اور اُن میں کس قدر باہمی اختلاف نمودار ہوئے۔

جواب: ایسا خود مسلم ممالک میں بھی ہوا ہے۔ مسلم مملکتیں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہی ہیں۔ لہٰذا اس باب میں، میں آپ سے متفق ہوں۔ بایں ہمہ، وسیع نقطۂ نگاہ سے، مذہب، احساسِ اخوت ضرور پیدا کر دیتا ہے۔

سوال: لیکن یہ احساسِ اخوت عملی مسائل کا حل تو نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) کیا آپ سمجھتے ہیں کہ تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک، پاکستان کو، محض اس لئے کہ یہ ایک مسلم قوم ہے خصوصی مراعات دے دیں گے۔

جواب: محض اس لئے نہیں کہ اہل پاکستان مسلم قوم ہیں، بلکہ اس لئے کہ ان تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک کے ساتھ مملکتِ پاکستان کا برتاؤ ہمیشہ یکساں رہا ہے۔ زندگی کے کئی عملی میدانوں میں ان میں اور پاکستان میں باہمی ربط و تعاون رہا ہے۔ اس سے تعلقات میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ (مجھے یہ تسلیم ہے کہ) ہمارا محض مسلمان ہونا اس قسم کے تعاون و اشتراک کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا۔ یہ صرف ایک جزوی عنصر ہو سکتا ہے لیکن دیگر عناصر بہت اہم ہیں۔

سوال: میں ایک ٹھوس مثال سے آپ کے نقطۂ نظر کی وضاحت چاہتا ہوں۔ کیا تیل برآمد کرنے والے ملک، ہندوستان جیسے غیر مسلم ملک کو بھی وہی مراعات دے دیں گے جو مراعات وہ پاکستان جیسے مسلم ملک کو دیں گے۔

جواب: شاہ ایران نے حال ہی میں، ہندوستان کو ایک خطیر رقم بطور قرض دی ہے۔ اور دیگر مراعات کا بھی اعلان کیا ہے۔

سوال: ان سوالات سے میرا مقصد آپ کے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر یہ دیکھنا تھا کہ آپ کے نزدیک محض مذہب کا رشتہ، اخوت اور رابطہ باہمی کی محکم بنیاد بن سکتا ہے؟ میں پھر ایک ٹھوس سوال کرنا چاہتا ہوں۔ ہندوستان نے بھی اپنے طور پر ان مسلم ممالک کی تائید و حمایت کی ہے۔ اور پاکستان نے بھی۔ کیا آپ کے نزدیک ان ممالک کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ وہ ہندوستان کو بھی وہی مراعات دے دیں جو مراعات وہ پاکستان کو دیں۔

جواب: ہندوستان نے اس قسم کی التزامی یا محکم تائید کبھی نہیں کی۔

سوال: میں طنزاً کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ مسئلہ ذرا نازک سا ہے۔

(بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ ۶ مئی ۷۴ء)

آپ نے غور فرمایا کہ نیویارک ٹائمز کے اس مینجنگ ایڈیٹر نے کس سادگی اور پُرکاری سے ایک نہایت اہم سوال پیش کیا ہے۔ مسٹر بھٹو کے جوابات، سیاسی نقطۂ نگاہ سے کیسے بھی ہوں لیکن، ہمارے نزدیک، دینی نقطۂ نگاہ سے وہ اطمینان بخش نہیں تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے سوالات کے اطمینان بخش جواب دیئے نہیں جا سکتے جب تک دین اور مذہب کا بنیادی فرق سامنے نہ ہو۔ کہنے کی بات یہ تھی کہ مذہب کی دنیا میں وہی کچھ ہوتا ہے جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے۔ مذہب کے پیشِ نظر، ہر فرد کی اپنی اپنی نجات ہوتی ہے اس لئے وہ کسی ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ مذہب کی سطح پر یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں کوئی فرق نہیں۔ ایک ہی مذہب کے پیرو مختلف ملکوں میں اشتراکِ وطن کی بنا پر مختلف قومیں ہوتے ہیں۔ ان کی الگ الگ مملکتیں ہوتی ہیں۔ وہ مملکتیں یا قومیں اپنے اپنے تقاضوں اور مصلحتوں کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ امن اور صلح کے معاہدے بھی کرتی ہیں، اور میدانِ جنگ میں، ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما بھی ہوتی ہیں۔ پھر ایک ہی ملک میں ایک ہی مذہب کے افراد، فرقوں میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں اور ان فرقوں کی بنیاد، باہمی نفرت اور عداوت پر ہوتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ یہی ہم مذہب افراد ایک دوسرے کے سینے میں خنجر گھونپتے ہیں حتیٰ کہ صحنِ مسجد تک میں نمازی، ایک دوسرے کا گلا کاٹ دیتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ مذہب بنائے اخوت اور وجۂ یگانگت نہیں بن سکتا۔

اس کے برعکس، دین انسانوں میں وجۂ جامعیت کا نام ہے۔ ایک دین کے پیرو خون، نسل، زبان، رنگ اور وطن کی حدود اور امتیازات کے علی الرغم امتِ واحدہ ہوتے ہیں۔ جن میں باہمی عداوت اور نفرت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ لوگ اپنے ایمان کے تقاضے سے ایک دوسرے کے بھائی اور خیر خواہ ہوتے ہیں ان کا میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جانا تو کجا، قرآن کا ارشاد ہے کہ اگر ایک مومن، کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دے تو وہ سیدھا جہنم میں چلا جاتا ہے۔ لہٰذا، باہمی اخوت اور یگانگت کا جو رشتہ دین کی رو سے قائم ہوتا ہے دنیا کی کسی اور وجۂ اشتراک سے اس قسم کا رشتہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اسلام، دین ہے اور جب تک مسلمانوں نے اسے دین سمجھا۔ ان میں، کسی قسم کا اختلاف اور افتراق پیدا نہ ہوا۔ اس وقت

تک ساری دنیا کے مسلمان ایک اُمت کے افراد تھے۔ ان کا سیاسی مرکز ایک تھا۔ ایک ہی اُن کا آئین تھا اور ایک ہی ضابطۂ قوانین۔ انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مختلف علاقوں میں الگ الگ حکومتیں قائم تھیں لیکن ان کی حیثیت بس یوں سمجھئے جیسے ایک مملکت کے صوبے ـــ اور صوبے بھی ایسے جن کے ذہن میں خود اختیاری کا تصور تک پیدا نہ ہو۔ لیکن اس کے بعد مسلمانوں نے بھی، دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا۔ اور پھر جو کچھ مذہب میں ہوتا ہے، وہی کچھ ان کے ہاں بھی ہونے لگا۔ آج بھی مسلمانوں کے ہاں، اسلام کی حیثیت ایک مذہب کی سی ہے۔ دین کی نہیں۔

مسٹر روز نقل کو یہ بات سمجھانے کی تھی اور اُس کے بعد یہ کہنے کی کہ ہماری کوشش یہ ہے کہ اسلام ہمارے ہاں پھر دین کی حیثیت حاصل کر جائے اور چونکہ اب اس کا احساس مختلف مسلم ممالک میں اُبھر رہا ہے، اس لئے ہمیں اُمید ہے کہ دُنیا کے مسلمان، پھر سے اُمتِ واحدہ بن سکیں گے۔ اس سلسلے میں ہم حالیہ سربراہی کانفرنس کی طرف اشارہ کر سکتے تھے لیکن اس نے اس ضمن میں ایک ایسا سوال پوچھ لیا جس نے نگاہ کا رُخ دوسری طرف پھیر دیا۔ اُس سوال کا ملخص یہ تھا کہ مسلم ممالک کے سربراہوں کی جو کانفرنس حال ہی میں، پاکستان میں منعقد ہوئی ہے۔ کیا اس کے اس طرح، اس موقع پر، پاکستان میں، منعقد کرنے کے فیصلے میں، ایک جذبہ یہ، بھی کارفرما نہیں تھا، کہ بنگلہ دیش پاکستان سے علیحدہ ہو گیا تھا جس سے، مغربی پاکستان میں رہنے والوں کے دل میں یہ احساس اُبھر آیا کہ ہم ایک مختصر سی قوم رہ گئے ہیں۔ دنیا میں ہمارا کوئی نہیں رہا۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے کیا انہیں یہ بتانا مقصود تھا کہ تم تنہا نہیں ہو۔ اتنے اسلامی ممالک تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر بنگلہ دیش تم سے الگ ہو گیا ہے تو پھر کیا ہُوا۔

اس کے جواب میں مسٹر بھٹو نے کہا کہ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مسلمانانِ پاکستان نے ہمیشہ اپنے آپ کو ایک وسیع اور عظیم مسلم برادری کا حصہ سمجھا ہے اس لئے لاہور کانفرنس کی اس لئے ضرورت لاحق نہیں ہوئی تھی کہ انہیں بتایا جائے کہ تم تنہا نہیں ہو۔ مسلمانانِ پاکستان کے دل میں یہ احساسِ اخوت و یگانگت تاریخی ارتقاء میں ان کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ مسلم کانفرنس کے انعقاد نے ان کے دل میں ایک تازہ روح پھونک دی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ مغربی ممالک کے یہ صحافی کیا بلا ہوتے ہیں اور وہ کس کس انداز سے کن کن اہم امور کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے جسے بیرونی طاقتیں بھی تسلیم کرتی ہیں کہ مسٹر بھٹو کا شمار خارجی سیاست کی بساط کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ اس لئے اس میدان میں انہیں آسانی سے الجھایا نہیں جا سکتا۔ اگر ان کی نگاہ، دین کے حقائق کو بھی محیط ہو جائے تو پھر وہ حقیقی معنوں میں "اسلامیہ جمہوریہ پاکستان" کے ترجمان کی حیثیت سے اُن بلندیوں سے بات کریں جن پر قرآنی اقدار، انسان کو لے جاتے ہیں۔

حقائق و عبر

۱- محسن کُش

جماعت اسلامی کے اجتماع میں (جو گذشتہ مارچ کو لاہور میں منعقد ہوا تھا) جماعت کی ۳۳ سالہ روئداد کے ضمن میں (۱۹۴۸ء کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے) کہا گیا:

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی حیات تک جماعتِ اسلامی اور حکومت کے درمیان تعاون کا رشتہ قائم تھا۔ امیر جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو ریڈیو پاکستان سے تقریروں کی دعوت دی جا رہی تھی اور مولانا محترم کے افکار سرکاری ابلاغِ عامہ کے ذریعہ سے پورے ملک میں پھیل رہے تھے۔ مولانا محترم نے جنوری سے جولائی تک سات ماہ کے عرصہ میں ریڈیو پاکستان سے دس تقریریں کیں۔

(ایشیا۔ ۳۱ر مارچ ۱۹۷۴ء)

امیر جماعت، میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا:

کمیونسٹ، سوشلسٹ اور لادین عناصر اگرچہ جماعت اسلامی کے خلاف قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی اکٹھے ہو گئے تھے لیکن انہیں قائداعظمؒ کی زندگی میں جماعت کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ بلکہ اسلامی نظام کے بارے میں جماعت کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تقریریں ریڈیو سے نشر ہوتی رہیں لیکن قائداعظمؒ کی آنکھ بند ہونے کی دیر تھی کہ جماعت کے خلاف کاروائی شروع ہو گئی اور مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈالا گیا۔

(ایشیا۔ ۷ر اپریل ۱۹۷۴ء)

ایشیا کے اداریہ میں، میاں صاحب کی اس تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا:

انہوں نے (میاں صاحب نے) بتایا کہ قائداعظمؒ نے تشکیلِ پاکستان کے بعد تحریکِ پاکستان کے دوران کے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیا اور جن لوگوں کو مسلم لیگ کے طریقِ کار

سے کچھ بھی اختلاف تھا اُنہیں وسعتِ قلب کے ساتھ اپنے سینے سے لگا لیا .....
مولانا مودودی کو سرکاری طور پر دعوت دی گئی کہ وہ ریڈیو پر اسلامی نظامِ حیات کی تشریح کریں۔
(ایشیا۔ ۷ر اپریل ۱۹۷۴ء)

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ قائداعظمؒ نے انتہائی کشادہ ظرفی سے کام لیتے ہوئے "اس مخالفت کو بالائے طاق رکھ دیا جو مودودی صاحب مسلسل سات آٹھ سال سے کرتے چلے آرہے تھے۔ اور نہ صرف یہ کہ ان واقعات کو رفت گزشت کر دیا بلکہ مودودی صاحب کو دعوتِ تعاون دی اور مخالفین کے مقابلہ میں ان کے لئے سپر بنے رہے۔

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ مودودی صاحب نے اس احسان کا جواب کس طرح دیا۔ پاکستان آنے کے بعد، ان کے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کی پہلی اشاعت جون ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ (اس میں انہوں نے اپنی ان ریڈیائی تقاریر کو بھی شائع کیا جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے۔) اس رسالہ کے افتتاحیہ (اشارات) میں انہوں نے گذشتہ تحریکِ پاکستان پر بھرپور تبصرہ کیا، اور اس کے بعد فرمایا کہ:

یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہمارے مُلک کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی۔
(ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۴۸ء)

اس کے بعد، (ہندوستان اور پاکستان، دونوں مملکتوں کے باشندوں کو مخاطب کرتے ہوئے) کہا:

اگر اب بھی ان کی لیڈرشپ تبدیل نہ ہوئی اور اگر اس نئے دَور میں بھی ان کے معاملات اُسی اندھی اور گندی قوم پرستی اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق پر چلتے رہے ..... تو (ایضاً)

اور اس کے بعد کہا کہ:

اگر (ان مملکتوں میں) شریف، معقول اور خدا ترس انسانوں کا کوئی عنصر موجود ہے تو وہ منظم ہو کر اُٹھے، اپنی قوم کی ذہنیت بدلنے کی کوشش کرے اور موجودہ قیادت کو بدل کر ایسے طریقے پر دونوں ملکوں کے معاملات چلائے جس سے ..... (ایضاً)

یہ کچھ، ترجمان القرآن کی پاکستان میں سب سے پہلی اشاعت میں لکھا گیا۔

پھر اس رسالہ کی اگلی اشاعت (بابت جولائی ۱۹۴۸ء) کے اشارات میں، اُسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے لکھا:

(اس تحریک میں) عام کارکنوں سے لے کر بڑے سے بڑے ذمہ دار لیڈروں تک میں انتہائی ناقابلِ اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے۔

اور آخر میں پھر اسی قیادت، کا رد نا روا جس سے محرومی اس تمام مخالفت اور شعلہ نوائی کا جذبہ محرکہ تھی۔ فرمایا:

اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں کیا ان کے حل کے لئے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلہ کو اس طرح حل کر چکی ہے۔ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آ پڑے ہیں جن کا بیشتر حصہ خود اسی قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔ انہیں حل کرنے کے لئے ہم اس پر اعتماد کریں!

اس کے بعد اگست ۱۹۴۸ء کے اشارات میں، تقسیم ہند کے عواقب پر بحث کرتے ہوئے لکھا:

(یہ) ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔

اس (اگست ۱۹۴۸ء) کے بعد قائداعظمؒ، وفات پا گئے تو مودودی صاحب کے سینے میں حسد اور انتقام کے بھڑکنے والے شعلے ٹھنڈے پڑے۔

ہم نے اس مقام پر اس نہایت تلخ داستان کو یہ بتانے کے لئے دہرایا ہے کہ ان حضرات کو خود اس کا اعتراف ہے کہ تشکیل پاکستان کے بعد، قائداعظمؒ، نے، اسلامی جماعت اور اس کے امیر کے ساتھ اس قدر کشادہ ظرفی اور حسن سلوک کا ثبوت دیا۔ اور ان صاحب نے اس کا جواب اس طرح دیا! ان دونوں کے کردار کا مقابلہ آپ خود کر لیجئے!!

۲۔ میکیاولی سیاست

روزنامہ امروز کی اشاعت بابت ۱۸ اپریل ۱۹۷۴ء میں شائع ہونے والی ایک خبر پڑھ لیجئے۔

ترکی کی سینٹ نے ایک بل منظور کیا ہے جس کے ذریعے ڈیموکریٹک پارٹی کے حقوق بحال کر دیئے گئے ہیں۔ ڈیموکریٹک پارٹی پر ۱۹۶۰ء میں وزیر اعظم عدنان مندریس کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے بعد پابندی لگا دی گئی تھی اور اسے انتخابات میں حصہ لینے سے روک دیا گیا تھا۔ سیاسی ذرائع کا کہنا ہے کہ ڈیموکریٹک پارٹی کے حقوق کی بحالی کے بل کی منظوری کے بعد سابق وزیر اعظم عدنان مندریس کو جنہیں پھانسی دے دی گئی تھی باوقار طور پر دفن کرنے کے لئے قومی قبرستان میں جگہ مہیا کی جائے گی اور پورے اعزاز کے ساتھ ان کی دوبارہ تدفین کی جائے گی۔

یہ ہے میکیاولی سیاست جس میں جوہر ذاتی کو کوئی نہیں پوچھتا، حیثیت ساری اقتدار کی ہوتی ہے جو پارٹی برسر اقتدار ہے اس کا ہر فرد لائق صد احترام ہے۔ جب اس سے اقتدار چھنتا ہے تو اس کے سب سے بڑے واجب الاحترام سربراہ کو تختۂ دار پر لٹکا دیا اور اس کی لاش کو کسی گڑھے میں پھنکوا دیا جاتا ہے۔ جب اس کی پارٹی پر سے پابندیاں اُٹھ جاتی ہیں تو اسی لاش کو اعزازات کے ساتھ دوبارہ دفن کیا جاتا ہے!

اس دور میں انسان کی کوئی حیثیت نہیں۔ حیثیت صرف سیاست کی ہے! الامان والحفیظ۔

۳۔ سفید ہاتھی کے کارنامے

مملکتِ پاکستان کے "سفید ہاتھی" موسوم بہ "ادارۂ تحقیقات اسلامیہ" کے کارناموں کے متعلق کبھی کبھی طلوع اسلام کے صفحات پر کچھ نمودار ہو جاتا ہے۔ مقصد اس سے یہ بتانا ہوتا ہے کہ اس غریب قوم کا لاکھوں روپیہ کس طرح اسلام کے نام پر ضائع ہو رہا ہے۔ حال ہی میں اس ادارہ کے کارناموں کو ایک بیرونی مملکت کی طرف سے "سارٹیفکیٹ" عطا ہوا ہے۔ جس کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ہوا یوں کہ پچھلے دنوں، روسی ادیبوں کا ایک سہ رکنی وفد پاکستان میں دورہ کرنے کے لئے آیا۔ معلوم نہیں کہ کسی منچلے کو کیا سوجھی کہ وہ اس وفد کو ادارۂ تحقیقات اسلامیہ لے گیا۔ روزنامہ نوائے وقت (راولپنڈی) کی ۱۵ اپریل کی اشاعت میں اس کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اسے ملاحظہ فرمائیے۔ لکھا ہے:

> یہ ادارہ ایوب خاں کے عہد میں آئین و قوانین کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ ابتداء میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن اس کے ڈائرکٹر تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی دال نہیں گلتی تو وہ کینیڈا اسدھار گئے۔ اور وہاں کی قومیت اختیار کر لی اس کے بعد اقتیار رات ڈاکٹر اصغر حسن معصومی کے ہاتھ آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھی الزامات کی لپیٹ میں آ گئے۔ (ویسے اُنہوں نے اپنا رانجھا راضی کر لیا تھا۔) آج کل ڈاکٹر لونا اس ادارے کے ڈائریکٹر ہیں۔ اس طویل عرصہ میں آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا۔ کہ یہ کھڑاک آج تک قومی خزانے پر بوجھ کیوں بنا ہوا ہے۔ وہاں جا کر دیکھیں تو یوں پتہ چلتا ہے کہ چند زنگ آلود چہرے کسی ایسے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں جہاں سے کوئی گاڑی نہیں گزرتی۔ اور خود ان میں راستہ تلاش کرنے کی سکت نہیں ہے۔ جب روسی ادیب اس ادارے میں گئے تو ادارے والوں نے اپنی اسلامی ریسرچ پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دے ڈالا اور بتایا کہ ادارے نے نظریہ پاکستان کے لئے کیا کیا کام کیا ہے۔ کچھ سننے کے بعد وفد کے لیڈر نے صرف ایک بات کہی کہ اگر آپ کی تحقیقات سے کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد ہوا ہو تو وہ دکھا دیجئے۔ تحقیقات کا تو مسئلہ ہی یہ ہوتا ہے۔ کہ اسے عملی شکل دی جائے۔
>
> ادارہ والے ایک دوسرے کو یوں دیکھنے لگے جیسے اومنی بس سروس میں بلا ٹکٹ سفر کرنے پر دھر لئے گئے ہوں۔

عربی خود سیکھئے کا چوتھا ایڈیشن چھپ کر آ گیا ہے۔ جلد منگا لیجئے۔
قیمت: ۷/- روپے (محصولڈاک ایک روپیہ الگ)
ادارہ طلوع اسلام - ۲۵-بی - گلبرگ II - لاہور

باب المراسلات

۱- قرآن کریم میں تحریف

طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۷۴ء میں 'عنوان بالا پر پرویز صاحب کا جو مختصر سا مقالہ شائع ہوا تھا' اس سلسلہ میں 'ملک کے مختلف گوشوں سے استفسارات موصول ہوئے کہ کیا "احمدی" حضرات کی طرف سے اس کا کوئی جواب شائع یا موصول ہوا ہے! پرویز صاحب نے اس موضوع پر جریدہ "پیغام صلح" (لاہور) کے مدیر کو، ۹ مئی کو ایک خط لکھا تھا جو اس وقت تک کی پوزیشن واضح کر دیتا ہے۔ وہ خط درج ذیل ہے:-

پرویز صاحب کا خط مدیر پیغام صلح کے نام

"پیغام صلح" بابت یکم مئی ۱۹۷۴ء میں "تحریف قرآن" کے سلسلے میں جو مقالہ شائع ہوا ہے میں نے اُسے بغور پڑھا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس طول طویل مقالہ میں، غیر متعلقہ باتیں تو بہت سی لکھی گئی ہیں۔ لیکن جو چیز اس تمام بحث کا نقطۂ ماسکہ یا سنگ بنیاد ہے اُس کا اس میں اشارۃً یا کنایۃً ذکر تک نہیں آنے دیا گیا۔ اس بحث کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ "اختلاف قرأت" کا مفہوم کیا ہے۔ آپ نے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر دہرایا ہے کہ اس سے مراد "آیت کی تفسیر و تعبیر" ہے میں نے اپنے مقالہ میں (جو طلوع اسلام کی مارچ ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ بتایا تھا کہ "اختلاف قرأت" کا مفہوم (حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کردہ روایت میں) خود اُن کی زبانی واضح کر دیا گیا ہے۔ وہ روایت یہ ہے (جسے تفسیر طبری میں زیر آیت ۴/۲۴ درج کیا گیا ہے۔)

> ابونضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم سورۃ النساء کی تلاوت نہیں کرتے۔ میں نے کہا۔ کیوں نہیں۔ کہا۔ پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمّٰی۔ میں نے کہا۔ نہیں۔ میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا تمہیں معلوم

ہونا چاہئے کہ اصلی آیت یونہی ہے عبدالاعلیٰ کی روایت میں بھی ابونضرہ سے اسی طرح کا واقعہ منقول ہے تیسری روایت میں بھی ابونضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباسؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی فما استمتعتم بہ منھن - ابن عباسؓ نے کہا - الیٰ اجل مسمیٰ - میں نے کہا میں تو اس طرح نہیں پڑھتا - انہوں نے تین مرتبہ کہا - "خدا کی قسم! خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے"۔

اس سے واضح ہے کہ (اس روایت کی رو سے) حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اختلاف قرأت سے مراد یہ تھی کہ متعلقہ آیت اُس طرح نازل ہوئی تھی جس طرح وہ پڑھتے تھے نہ کہ اُس طرح، جس طرح وہ مروجہ قرآنی نسخوں میں درج ہے۔ میں تو اختلاف قرأت کے عقیدہ اور اُس کی تمام تائیدی روایات کو وضعی اور قرآن کے خلاف سازش سمجھتا ہوں لیکن جو شخص اختلاف قرأت کو مانتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ اس کے اُس مفہوم کو بھی تسلیم کرتا ہے جسے (مندرجہ بالا روایت کی رو سے) خود حضرت ابن عباسؓ نے بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ آیت دراصل نازل اسی طرح ہوئی تھی جس طرح حضرت ابن عباسؓ پڑھتے تھے۔

۲۔ میرزا صاحب نے قرأت حضرت ابن عباسؓ کو اپنے دعوئے محدثیت کی تائید میں پیش کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ "قرأت" کے اس مفہوم کو بھی تسلیم کرتے تھے جسے حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ تو بڑی مضحکہ انگیز سی صورت ہوگی کہ آپ قرأت حضرت ابن عباسؓ کو تو مانیں لیکن اُس کا جو مفہوم خود ان کی طرف منسوب ہے اُس سے انکار کریں اور اس کی جگہ خود اپنا مفہوم رکھ دیں۔

اور جب حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کردہ مفہوم کو تسلیم کیا جائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ آپ اسے تسلیم کرتے ہیں کہ یہ آیت دراصل نازل اُسی طرح ہوئی تھی جس طرح قرأت ابن عباسؓ میں آئی ہے نہ کہ اس طرح جس طرح یہ قرآن کریم کے مروجہ نسخوں میں درج ہے۔

۴۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ میرے اس عریضہ کو پیغام صلح میں شائع کرکے اس کا جواب شائع فرمائیں گے۔ تاکہ صحیح تصویر آپ کے قارئین کے سامنے آجائے۔"

ان سطور کی تسوید تک، نہ ان کی طرف سے کوئی جواب موصول ہوا ہے، نہ ہی ان کے اخبار میں جواب شائع ہوا ہے۔

۲۔ ان حضرات کی یہ کوشش ناکام کہ اپنے قارئین (یا حلقہ ارادت) کو اس بحث کے بنیادی نقطہ سے تاریکی میں رکھا جائے۔ اُس قلبی ضیق اور اضطراب کی غماز ہے جس میں یہ (بیچارے) گرفتار ہیں۔ ان کی کیفیت وہی ہے جسے قرآن کریم نے، آویزش صاحب ضرب کلیم (حضرت موسیٰؑ) اور اہل فرعون کے سلسلہ میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (۲۷/۱۴)۔ ان کا دل تو مانتا تھا کہ جو کچھ (حضرت) موسیٰؑ کہتے ہیں، وہ سچ ہے، لیکن ان کا پندار نفس انہیں اس کے اعتراف کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس لئے وہ کج بحثی کئے جاتے تھے۔ یوں وہ اسی نفسیاتی کشمکش میں گرفتار تھے جسے قرآن "دلوں کو گھیر لینے والی آگ" سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ حضرات جانتے

ہیں کہ (خود حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کردہ روایت کے مطابق) "اختلاف قرأت" کا مفہوم کیا ہے۔ لیکن اگر وہ اس مفہوم کو تسلیم کرتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ میرزا صاحب (اور خود یہ حضرات) تحریف فی القرآن کے قائل قرار پا جاتے ہیں" بلکہ مرزا صاحب کے دعوے "محدثیت" کی ساری عمارت دھڑام سے زمین پر آگرتی ہے۔ اس کا، ان کی (گرفتارِ پیچ و تاب) سمجھ میں یہی علاج آیا کہ اپنے جواب (شائع کردہ یکم مئی) میں اس نکتہ ہی کو گول کر دیا جائے۔ لیکن یہ ان کی خود فریبی ہے۔ یہ حربہ (سابقہ دور کے) مناظروں میں تو چل جایا کرتا تھا۔ اب نہیں چل سکتا۔ اب اُن کے متبعین، "پیغام صلح" کے ساتھ طلوع اسلام کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم اگر ان کا تعاقب نہ بھی کریں، تو خود وہ لوگ ان کا گریبان پکڑ لیں گے۔

جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

باقی رہے اہل ربوہ، تو ہمارے نزدیک وہ ان سے زیادہ سمجھدار نظر آتے ہیں۔ انہوں نے سعدیؒ کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے کہ

تا مرد سخن نگفتہ باشد - عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اپنے ہاں (الفضل میں) اس بحث کو چھیڑا ہی نہیں۔

۲۔ یوم اقبالؒ کا اجتماع

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"۲۰ر اپریل کی شام، یوم اقبالؒ کے سلسلہ میں ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے، وائی۔ ایم سی۔ اے ہال میں جو اجتماع ہوا، مجھے اس میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آپ کے ادارہ کی طرف سے منعقدہ کسی تقریب میں، میں شریک ہوا اور جو تاثرات لے کر میں لوٹا جی نہیں چاہتا کہ اس پر میں آپ کی خدمت میں ہدیہ مبارکباد پیش نہ کروں۔ آج کل جلسوں میں جو ہڑبونگ مچتی ہے، اس سے کون واقف نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اب ان اجتماعات میں جانا ہی چھوڑ دیا ہے۔ لیکن آپ کا یہ اجتماع جس قدر سنجیدہ اور پُروقار تھا اس کی مثال نہیں ملتی۔ پرویز صاحب کا خطاب بھی مجھے پہلی مرتبہ سننے کا اتفاق ہوا۔ اور مجھے بے حد افسوس ہوا کہ میں نے اس سے پہلے ان کے خطابات سے اپنے آپ کو کیوں محروم رکھا۔ یہ خطاب قریب دو گھنٹے پر پھیلا ہوا تھا۔ موضوع بھی بڑا مشکل اور فلسفیانہ تھا۔ اور مجمع بھی یوں کہئے کہ مخلوط سا۔ لیکن خطاب اس قدر سحر آفریں تھا کہ سامعین میں سے کسی نے اونچی سانس تک نہ لی۔ اور جب خطاب ختم ہوا تو کسی کو احساس تک نہ ہوا کہ دو گھنٹے گذر گئے ہیں۔ علاوہ بریں، مجھے اس دن پہلی بار سمجھ میں آیا کہ علامہ اقبالؒ قوم سے کیا کہہ گئے ہیں، اور ان کے پیغام کا سرچشمہ کیا ہے۔

یہ سب کچھ تو ہوا۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے اس کے بعد مختلف اخبارات

(بقایا بر صفحہ ۵۳)

(سابق صدر) محمد ایوب خان (مرحوم) کی یاد میں

مرا مرنا خلوصِ نوحہ گر کی آزمائش ہے۔

گذشتہ ماہ (۲۰ اپریل کی شام) سابق صدر محمد ایوب خان کی رحلت کی خبر اس وقت موصول ہوئی جب طلوع اسلام (بابت مئی) کا پرچہ پریس میں جا چکا تھا۔ لہٰذا، اس میں ہم اپنے تاثرات کے اظہار سے قاصر و معذور رہے۔

گروہ بندانہ سیاست کی ایک بنیادی خرابی یہ بھی ہے کہ اس میں اپنی پارٹی کے افراد کے عیوب بھی محاسن بن کر نظر آتے ہیں، اور فریق مقابل کے افراد کی خوبیاں بھی برائیاں دکھائی دیتی ہیں، اور اگر کوئی شخص ان کی کسی خوبی کو خوبی کہہ کر پکارے، تو اسے بھی ہدفِ صد طعن و تشنیع قرار دیا جاتا ہے۔ اس ذہنیت کی بنا پر، تعصب، نفرت اور تنگ نظری کسی حد تک شدت اختیار کر جاتی ہے۔ اس کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کے صدارتی انتخاب کے سلسلہ میں، احزاب مخالفت نے (صدر) ایوب (مرحوم) کے مقابلہ میں محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کو امیدوار کھڑا کیا تھا۔ مودودی صاحب اس سے پہلے شریعت حقہ کا یہ فتویٰ صادر فرما چکے تھے کہ اسلام میں عورت کے لئے سیاسیات میں حصہ لینا قطعاً جائز نہیں۔ لیکن اس کے باوجود، انہوں نے مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کی تائید کا فیصلہ کیا، اور ان دونوں امیدواروں کا مقابلہ کرتے ہوئے انہوں نے، موچی دروازہ کے باہر اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ:

> ایک طرف ایک مرد ہے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں اور دوسری طرف ایک عورت ہے جس میں عورت ہونے کے سوا کوئی عیب نہیں۔ (ایشیا - ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۴ء)

یہاں تک پہنچا دیتی ہے انسان کو گروہ بندانہ عصبیت!

طلوع اسلام کی چونکہ کوئی پارٹی نہیں (وہ قرآن کریم کی رو سے، پارٹی بازی اور فرقہ بندی کو شرک سمجھتا ہے) اس لئے اس کا دامن، اس قسم کے تعصب، نفرت اور تنگ نظری سے پاک چلا آ رہا ہے۔ وہ ہر اس بات کی تائید اور تعریف کرتا ہے جو پاکستان کے استحکام، اُمت کے مفاد، اور قرآن کریم کے مطابق ہو، خواہ وہ کسی کی طرف سے بھی کیوں نہ آئے۔ اور ہر اس بات کی مخالفت کرتا ہے جو مفادِ مملکت۔ اور قرآنی تعلیم کے خلاف ہو۔ خواہ اس کا کہنے والا کوئی بھی ہو۔ گذشتہ چھبیس سال میں، پاکستان میں جو پارٹیاں بھی برسر اقتدار آئیں اور جس فرد کے ہاتھ میں بھی زمام حکومت رہی، طلوع اسلام نے یہی روش اختیار کی اور اس پر قائم رہا۔ لیکن جن لوگوں کا

مسلک یہ تھا کہ انہوں نے ہر حکومت کی مخالفت کرنی ہے (محض اس لئے کہ زمام حکومت ان کے ہاتھ میں کیوں نہیں دی جاتی) وہ اس بات کو کب برداشت کر سکتے تھے کہ برسر اقتدار فرد یا گروہ کی کسی بات کی تعریف کی جائے۔ اس کے لئے ان کے پاس آسان حربہ یہ تھا کہ اسے "ٹوڈی" کہہ دیا جائے ـــــ یعنی خوشامدی، منصب پرست، حکومت نواز، وغیرہ وغیرہ۔ طلوعِ اسلام کے خلاف بھی یہ سب کچھ کہا جاتا رہا لیکن اس نے طعن و تشنیع کے ان تمام تیروں کو برداشت کیا اور حق بات کی تائید کے مسلک کو نہ چھوڑا اور نہ ہی کسی قسم کی تخویف و ترہیب کے احساس سے، غلط بات پر ٹوکنے سے احتراز برتا، خواہ وہ بات بڑے سے بڑے طاقت ور گوشے ہی کی طرف سے کیوں نہ آئے۔

اس مسلک کی رُو سے، طلوعِ اسلام نے جہاں (سابق صدر) ایوب کی غلطیوں پر انہیں ٹوکا اور بے محابا ٹوکا، وہاں ان کے صحیح افکار و اقدامات کی تعریف کی۔ آج (سابق صدر) ایوب خان ہم میں نہیں۔ وہ وہاں ہیں جہاں سے وہ نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ لہٰذا آج ان کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے گا۔ اُسے یقیناً بے لوث اور بے لاگ تصور کیا جانا چاہئے۔ لیکن ہم مرحوم کے متعلق اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ ہم ان کے وہ خیالات پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں جن کی بنا پر ہم انہیں ان کی زندگی میں بھی مستحقِ تحسین سمجھا کرتے تھے۔ اور ان کی وفات کے بعد بھی انہیں جذباتِ تکریم و احترام سے یاد کرتے ہیں۔ ہم اُن کے افکار و خیالات کو اس زمانے سے شروع کرتے ہیں جب زمام اقتدار ان کے ہاتھ میں آئی۔ اور اس کے بعد انہیں سلسلہ وار پیش کئے چلے جاتے ہیں۔ اگر آپ ان خیالات پر غیر جانبدارانہ انداز سے نگاہ ڈالیں گے تو ہمیں اُمید ہے کہ ہم نے ان کے متعلق جو کچھ اُوپر کہا ہے۔ آپ بھی اس کی تائید کریں گے

دسمبر ۱۹۵۸ء - لاہور

مرحوم اکتوبر ۱۹۵۸ء میں برسر اقتدار آئے اور انہوں نے ۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء کو، باشندگانِ لاہور کی طرف سے پیش کردہ ایڈریس کے جواب میں (گلستانِ قاطمہ میں) فرمایا:

اکتوبر کے انقلاب کا فلسفہ وہی تھا جو پاکستان کی تخلیق کا موجب بنا تھا۔ برسوں کی بدنظمی اور بددیانتی نے اس فلسفہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو داغ دار اور زنگ آلود بنا دیا تھا جو تشکیلِ پاکستان پر منتج ہوئی تھی۔ اب حکومت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ ان مقاصد و مطامح کو اس دلدل سے نکال کر اس طرح صیقل کر دیا جائے کہ انہیں ان کی کھوئی چمک دمک اور گم گشتہ عزت و عظمت پھر سے نصیب ہو جائے۔

مارچ ۱۹۵۹ء - راولپنڈی

انہوں نے مارچ ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہے کہ ہم اُس آئیڈیالوجی کا احیاء اور استحکام کریں جس کی رُو سے پاکستان بحیثیت ایک آزاد مملکت کے وجود پذیر ہوا۔ پاکستان محض ایک خطۂ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ایسی ملت ہے جو مخصوص اخلاقی اور روحانی اقدار کی امین ہے۔ یہ اقدار اسلام پر مبنی ہیں۔ ہمارے تجدد پسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام لینا فیشن کے خلاف (اور

قدامت پرستی کی دلیل ہے) یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔ اس کے برعکس یہ امر ہمارے لئے موجب صد ہزار فخر و مباہات ہونا چاہیئے کہ ہم ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو ہمیں اس قسم کی بلند اقدار کی تعلیم دیتا ہے۔ مثلاً خدا ترسی۔ بنی نوع انسان سے محبت۔ ہمسایہ سے مودّت۔ یتامےٰ کی نگہبانی اور غریبوں کی امداد۔ یہ اسلام کی وہ بنیادی اقدار ہیں جن کے بغیر نہ تم اچھے انسان بن سکتے ہو، نہ اچھے پاکستانی۔

جولائی ۱۹۵۹ء - مری

انہوں نے، جولائی ۱۹۵۹ء میں مری میں، کمشنروں کی کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ہمارے سامنے اس وقت دو اہم مسائل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایک مشترک اسلامک آئیڈیالوجی کے ماتحت لوگوں میں اتحاد پیدا کریں اور اس آئیڈیالوجی کی تشریح و تبیین عصرِ حاضر کی زبان میں زمانے کے موجودہ تقاضوں کے مطابق کی جائے۔ اس آئیڈیالوجی کو روحِ اسلام سے کشید کیا جائے اور ہمارا زمانہ جس حد تک ترقی کر چکا ہے اس کی روشنی میں اس کی تعبیر کی جائے۔ اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہلِ فکر و نظر حضرات کو دعوتِ غور و تدبّر دی جائے کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا، نہایت معقول حل دریافت کریں۔ دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ، ٹھوس اور مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ انسانی دل و دماغ کبھی آئیڈیالوجی پر، خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو کبھی لبیک نہیں کہتا جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس لئے اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔

ٹنڈو الہ یار

انہوں نے (مئی ۱۹۵۹ء میں) ٹنڈو الہ یار کے مقام پر، علماء کے اجتماع سے خطاب فرمایا تھا جو اپنی جامعیت اور اہمیت کے اعتبار سے، ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے کہا تھا۔

کوئی چودہ سو برس کا عرصہ ہوا کہ اسلام فضائے ہستی پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوا۔ یہ (مذہب نہیں تھا بلکہ) ایک ترقی پسندانہ تحریک تھی جو اپنے زور دروں سے بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس نے حیاتِ انسانی کو نیا پیکر، اس کی جدد جہد کو نئی تعبیر اور کاروانِ انسانیت کو نئی منزل عطا کر دی۔

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

جب تک یہ تحریک زندگی کا جزو بنی رہی اس کے متبعین دُنیائے سائنس اور عملی علوم میں ایسے ایسے کارنامے دکھاتے رہے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے کچھ زمانہ گذرنے کے بعد، مسلمانوں نے اسلام کو نظری مذہب میں تبدیل کر دینے پر اپنی توجہات مرکوز کر دیں۔ اور دین بحیثیت تحریک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زندگی اور مذہب میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی۔ یہ تفریق آج تک ہماری زندگی کو متاثر کئے جا رہی ہے۔ اسلام اس تفریق (یعنی مذہب اور زندگی کی ثنویت) کو مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن یہ فطرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ خود اسلام کے متبعین اس ثنویت کا شکار ہو کر رہ گئے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جائے، تو زندگی تو بہرحال کسی نہ کسی سمت میں چلتی ہی رہتی ہے، لیکن

مذہب ایک ایسی بے جان شے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے، نہ حرکت اور نمو کی صلاحیت۔ یہ جامد اور متحجر مذہب (زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے) مسجدوں اور خانقاہوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ یہی ہوا۔ انسانیت، سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے، لیکن ہمارا مذہب صدیوں سے ایک ہی مقام پر ساکت و صامت کھڑا ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ تھا کہ اُس نے بُت پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بُت بنا دیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ اس کے متعلق انہوں نے فرمایا۔

مذہب کو یوں بُت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ، جس نے ہماری ملی ذہنیت اور ثقافت پر تباہ کن اثر ڈالا ہے یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصر حاضر کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے قدم اُٹھایا۔ ان پر "دنیا دار مسلمان" کی مہر ثبت کر دی گئی۔ اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دنیا میں جمود و سکون کے مجسمے بن کر رہ گئے وہ سچے اور پکے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ مستقبل کی طرف نگاہ رکھ کر شاہراہِ حیات پر آگے بڑھنے والے اسلام سے منحرف اور برگشتہ شمار ہونے لگے، اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدس دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئے اقدام، ہر نئی ایجاد، ہر نئی تعلیم کے متعلق یہ شور برپا کر دیا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں ہر انقلابی راہ نما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے۔

اپنے اس دعوے کی شہادت میں انہوں نے کہا۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ذرا ان خطبات کا خالی الذہن ہو کر جائزہ لیں جو ہمارے ملک کی ہر مسجد میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ موجودہ زمانہ کی چھوٹی سے چھوٹی بات پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ بات نئی ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے کہ اس قسم کے بلند اور باعزت دین کو ترقی کا دشمن (اور علم و بصیرت کا حریف) بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ صرف اسلام کے ساتھ ہی ظلم نہیں ہمارے ان نوجوانوں کے ساتھ بھی ظلم ہے جو آج کل کی ماڈرن دنیا میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز زندگی اور مذہب دونوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے کہ بیسویں صدی کے انسان پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ اگر اسے اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا ہے تو اسے کئی سو برس پیچھے جانا پڑیگا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام جیسا ترقی پسند، زندہ، دین اس قسم کا جامد مذہب کیسے بن گیا؟

اس کے جواب میں انہوں نے پہلے اس کی چند وجوہات استفہامیہ انداز میں خود ہی بیان کیں۔ انہوں نے کہا۔

(۱) کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی نصب العین سے بھٹک گئے ہیں اور ایسا معاشرتی اور سیاسی نظام وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں جو بدلتے ہوئے تقاضوں اور تغیر پذیر قدروں کے ساتھ چلنے کی سکت رکھتا؟

(۲) یا ہم نے اپنے دین کو جنوں اور فرشتوں کی کہانیاں بنا کر اسے توہم پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور اندھی

تقلید کا نعرہ بلند کر کے انسان کی تخلیقی آرزوؤں کا راستہ روک دیا ہے ؟

(۳) یا اس کی وجہ وہ تصوف ہے جس نے (زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے) ہم میں فرار کی ذہنیت پیدا کر دی ہے اور زندگی کو قبروں اور حجروں میں محبوس کر دیا ہے ؟

(۴) یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یہ غلط عقیدہ وضع کر رکھا ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اگلی دنیا میں نجات کے حقدار بن سکتے ہیں۔ کیا ہم اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہماری اس زندگی کے اعمال کا ثمر ہے اور ہم جنت میں وہی کاٹیں گے جو کچھ ہم دنیا میں بوئیں گے۔

ان سوالات کو پیش کرنے کے بعد انہوں نے کہا۔

یہ سوالات بہت اہم ہیں۔ ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم ان عناصر کی جڑ کا سراغ لگائیں جنہوں نے اسلام کی برق آسا، شعلہ صفت روح کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تحقیق میں ہمارے سامنے بہت سی ایسی حقیقتیں آئیں گی جو نہایت تلخ اور ناخوشگوار ہوں گی۔ لیکن ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم تلخیوں اور ناخوشگواریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یقین محکم کے ساتھ بیباکانہ انداز میں سرگرم جستجو رہیں۔

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

عالم اسلام کے تشتت و انتشار کا ایک بڑا سبب مذہبی فرقہ بندی ہے۔ غلط یا صحیح، فرقے بہرحال موجود ہیں اور اس حقیقت سے صرف نظر کرنا حماقت ہے۔ اگر یہ بحث چھیڑ دی جائے کہ کون سا فرقہ حق پر ہے اور کونسا باطل پر تو اس کا نتیجہ تخریب کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے صحیح طریق یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے اختلافی نکات کو ابھارنے کے بجائے ان امور پر زور دیا جائے جو ان میں مشترک ہیں کیا یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ ایک دوسرے کی نکتہ چینی کرنے کی بجائے ہم اس پر زور دیں کہ اصل و بنیاد کے اعتبار سے، ہم سب ایک ہیں۔ اس لئے کہ ہم سب ایک خدا۔ ایک رسولؐ اور ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔

ان اندرونی خرابیوں کے بعد انہوں نے اس بیرونی خطرہ کا ذکر کیا جو اسلام کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ انہوں نے کہا۔

آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور ان کی باہم کشمکش آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ کمیونزم تہیہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پر مسلط کر دے۔ "مذہب" کمیونزم کا کوئی مؤثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا اس لئے کہ اس کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے نمودار ہوتی ہیں نظام کائنات میں ان کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ نوع انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اندریں حالات کمیونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ اور مغرب کی مادی اقدار (کی کشمکش) میں صرف اسلام ہی وہ فطری آئیڈیالوجی پیش کر سکتا ہے جو روح انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے"۔

خطرہ کی روک تھام کے سلسلہ میں انہوں نے فرمایا۔

کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصر حاضر کی

روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے بلکہ ایک تمدنی، سیاسی، معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔

پاک جمہوریت کا دورہ

دسمبر ۱۹۵۹ء کے دوسرے اور تیسرے ہفتے میں مرحوم نے ملک کے مختلف گوشوں کا برق رفتاری سے دورہ کیا۔ اس دورہ میں مختلف مقامات پر اہم تقاریر ہوئیں۔ اور پیغامات دیئے گئے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۷ دسمبر کو ملتان میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے، پاکستان کا دستور، یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا۔ لیکن (یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ) اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات، تفصیلات اور طریقے، حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔

گجرات میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

پاکستان ایک آئیڈیالوجی کی بنا پر وجود میں آیا ہے۔ اور وہ آئیڈیالوجی اسلامک ہے۔ اس لئے اس میں شبہ کی گنجائش کہاں ہوسکتی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی آئیڈیالوجی کا آئینہ دار ہوگا۔ آئین کمیشن ان حضرات پر مشتمل ہوگا جنہیں اسلام کی بھی پوری پوری واقفیت ہو اور جو علوم حاضرہ سے بھی باخبر ہوں۔ اس لئے کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ملک کو تیرہ چودہ سو سال پیچھے دھکیل دیا جائے۔ اگر کمیشن کی سفارشات اس معیار پر پوری نہ اتریں تو کابینہ انہیں کبھی منظور نہیں کرے گی۔ اور اگر بفرض محال کابینہ بھی انہیں منظور کرلے اور پارلیمان دیکھے کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہیں تو وہ دو تہائی کی اکثریت سے ان میں تغیر و تبدل کرسکے گی۔

ادارۂ تحقیقات اسلامیہ

۱۳ جولائی ۱۹۶۰ء کو ادارۂ تحقیقات اسلامیہ (انسٹیٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ) کراچی، کے گورنروں کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے آپ نے کہا۔

اس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول کون سے ہیں اور جن طریقوں سے ان اصولوں کو عمل میں لایا گیا تھا وہ کیا ہیں۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس باب میں کوئی الجھن باقی نہ رہے کہ اسلام میں کون سی باتیں غیر متبدل ہیں اور کون سی ایسی ہیں جن میں تغیر و تبدل کیا جاسکتا ہے۔

آگے چل کر آپ نے کہا۔

سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ لوگوں سے یہ کہہ دیا گیا کہ وہ کسی بات کا فیصلہ خود نہیں کرسکتے۔ ان سے کہا گیا کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس پر آنکھیں بند کرکے چلتے جائیں (اور عقل و فکر سے کبھی کام نہ لیں) لیکن اب لوگ اس طرح کی اندھی تقلید کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔

اور اس کے بعد فرمایا۔

بیس تیس برس کے بعد کوئی شخص تمہاری آواز سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا جب تک تم ایسی بات نہ کہو گے جو عقل

عامہ کو اپیل کرے اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے۔

یوم انقلاب ۱۹۶۰ء

۲۷ اکتوبر ۱۹۶۰ء کی شام، عسکری انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریب پر انہوں نے ریڈیو پر جو پیغام قوم کے نام نشر کیا۔ اس میں کہا۔

علامہ اقبالؒ نے جن کا شمار عصر حاضر میں، روح اسلامی کے بہترین روشن دماغ ترجمانوں میں ہوتا ہے کس قدر سچی بات کہی ہے کہ اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر اور تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم وضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر و تبدل کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان نہیں۔ وہ تغیر جسے خود قرآن نے آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔ تو اس سے زندگی، جو حتماً متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو سیاسی اور روحانی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ابدی اقدار پر ان کی گرفت نہیں رہی تھی۔ اور گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام کی قوت میں جو ضعف آیا ہے تو اس کی وجہ یہی جمود و تعطل تھا۔

اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا وقت آیا ہے کہ ۹ کروڑ مسلمانوں کو اس بات کا موقع ملا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور زندگی کے روزمرہ کے مسائل میں امتزاج پیدا کرنے کے پروگرام میں شریک ہو سکیں۔

اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے آگے چل کر کہا۔

قرآن کریم کی اہم تعلیمات سے ایک یہ بھی ہے کہ حیات ایک ترقی پذیر مسلسل عمل تخلیق ہے۔ اس لئے ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل آپ تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں اپنے اسلاف (کے علمی سرمایہ) سے راہ نمائی لے لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے۔

اس کے بعد کہا۔

ہمارے سامنے پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ کو از سر نو منضبط کریں اور اسلامی آئیڈیالوجی کو اس کی بنیاد قرار دیں حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقصد تھا جو تخلیق پاکستان کے لئے وجہ جواز قرار پایا تھا۔ اس مقصد کی طرف پہلا قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے قلوب و اذہان کو دو قسم کی نفسیاتی الجھنوں سے آزاد کرائیں۔ ان میں سے ایک الجھن جدید تعلیم کی پیداوار ہے۔ یہ تعلیم ہمارے دورِ غلامی میں رائج کی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہاں کی ہر شے، جس میں دین بھی شامل ہے، فیشن کے خلاف سمجھی جانے لگی۔

دوسری الجھن ان جامد عقائد کی پیداوار ہے جنہوں نے دین کی روح کو تعصب، توہم پرستی اور گلا گھونٹ دینے والے خیالات کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی دکھائی دے گی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا یہ (نام نہاد) تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ، دونوں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ پلیٹ فارم ہے "دینی جہالت" (یعنی دین کے متعلق نہ انہیں کچھ علم ہوتا ہے نہ انہیں)۔

ممالک اسلامیہ کا دورہ

نومبر ۱۹۶۰ء میں مرحوم نے ممالک اسلامیہ کا دورہ فرمایا' اور حجاز اور مصر کے اہم مقامات پر ایسی پُرشکوہ اور حقیقت کشا تقاریر کیں جن کی صدائے بازگشت مدتوں تک ان مقامات میں گونجتی رہی۔ انہوں نے ۶/نومبر کو سعودی عرب کے دارالحکومت' ریاض میں' ملٹری اکاڈمی کا معائنہ کرتے ہوئے وہاں کے افسروں اور سپاہیوں سے کہا۔

یہ اسلام کا پیغام تھا جس نے ماضی میں مسلمانوں کو اس قدر عظمت اور شوکت عطا کی تھی۔ اگر ہم پھر اسی عظمت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے ــــ اور وہ طریقہ ہے اسلام سے متمسک ہو جانے کا۔ اگر ہم نے ایسا کیا' تو مجھے اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ (دنیا کی) امامت پھر ہمارے حصہ میں آجائے گی۔

۹/نومبر کو انہوں نے جدہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

آج ساری دنیا' سیاسی اور مادی آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر' اپنے اپنے گروہوں کی تشکیل کر رہی ہے۔ ان تصورات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا' لیکن یہ تصورات' انسان کی انتہائی منزل کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتے۔ اس دنیا میں اور اُخروی زندگی میں (نوع انسان کی) نجات صرف اس آئیڈیالوجی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے جو انسان کے مادی اور روحانی تقاضوں میں صحیح صحیح توازن قائم کرسکے۔ ہم مسلمانوں کی خوش بختی ہے کہ ہمارے پاس وہ آئیڈیالوجی' دین اسلام کی شکل میں موجود ہے ــــ مسلم ممالک کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں کی درستی کے بعد' اسلام کی عالمگیر برادری کی تشکیل کریں اور اس میں باہمی رقابتوں کو دخیل نہ ہونے دیں۔

۱۶/نومبر کو قاہرہ کی ایک تقریر میں کہا۔

جب تک ہم اسلام کے بنیادی اصولوں سے متمسک رہیں گے' مادی' سیاسی یا مملکتی حدود کا کوئی خیال' ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے جُدا نہیں کرسکے گا۔ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو وحدتِ مقصد اور یقین کی اس دولت سے مالا مال کر دے جس کا اسلام نے حکم دیا ہے اور جو' آج کی دنیا میں' جس میں آئیڈیالوجی کی کشمکش ہو رہی ہے' ان کے نصب العین حیات کا تقاضا ہے۔

اسی تقریر میں آگے چل کر فرمایا۔

جو لوگ ایمان کے رشتے' سے باہمدگر پیوست ہوں' وہ ان تمام قوتوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں جو ان میں تنازع اور تشتت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اور جب یہ ایمان' اسلام کا عطا کردہ ایمان ہو' تو ان میں باہمی افتراق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس لئے کہ اسلام' اختلافات کے مقابلہ میں اخوت' اشتعال انگیزی کے مقابلہ میں نرم روی اور سہار' غلط فہمیوں کے مقابلہ میں باہمی افہام و تفہیم اور غصہ کے مقابلہ میں عفو اور درگذری کی روح ہے۔

۹/نومبر کو انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں ایک معرکہ آرا تقریر کی جس کے دوران میں کہا۔

مسلمان کہیں بھی ہو' وہ اپنے اللہ سے اور خود اپنی ذات سے ایک عہدِ وفا استوار کرتا ہے۔ یہ عہدِ وفا دنیا کی ہر دوسری

وفاشعاری کے عہد سے بلند ہے۔ یہ عہد وفا ہے ایمان کا۔ یہی وہ عہد وفا ہے جس کی وجہ سے، دنیا کے تمام مسلمان، حکومتوں کے سیاسی اختلافات اور خارجی نزاعات کے علی الرغم، رشتۂ اخوت و مودت میں منسلک نظر آتے ہیں اور خیر سگالی اور خیر اندیشی کی غیر مرئی گرہیں انہیں ایک دوسرے سے پیوست رکھتی ہیں میری دعا ہے کہ باہمی مودت اور محبت کا یہ وسیع و عمیق چشمہ دن بدن وسیع سے وسیع تر اور عمیق سے عمیق تر ہوتا جائے اور خدا انہیں اس سے محفوظ رکھے کہ وہ اسے، ہنگامی فائدوں یا عارضی مصلحتوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

باہمی محبت اور اخوت کا نتیجہ یہ ہے کہ الجیریا کے مسلمانوں پر مظالم ہوں، یا فلسطینی پناہ گزینوں پر، کشمیری مسلمانوں کے جانکاہ مصائب ہوں یا اسرائیلی حکومت کی آئے دن کی دھمکیاں (یہ مقامی اثرات نہیں رکھتیں بلکہ) تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل میں یکساں جذبات ہمدردی کو بیدار کر دیتی ہیں۔

انہوں نے اپنی جدہ کی تقریر میں یہ بھی کہا کہ

ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سامنے کوئی اخلاقی اور روحانی آئیڈیالوجی ہو جس سے وہ اپنے مادی اور بلند اقدار کے تقاضوں میں توازن قائم کر سکے۔ ہمارے لئے یہ آئیڈیالوجی لازماً اسلام کی ہے۔ یہ امر موجب تاسف ہے کہ لوگ بالعموم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مذہب انسان (کے فائدے) کے لئے دیا گیا تھا، انسان کو مذہب (کے کسی فائدے) کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ اس حقیقت کو فراموش کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ مذہب کی قوتوں کو انسان کی خدمت کے لئے استعمال کیا جائے، اسے زندگی کے حقائق سے یکسر الگ کر دیا گیا ہے۔

اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ دین کے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریقے، زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن (یہ بھی ضروری ہے کہ) یہ تبدیلی صحت مندانہ ہو۔

پاکستان، اس بنیادی مسئلہ کے حل کے لئے امکان بھر کوشش کر رہا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم ایسا آئین مرتب کریں جو ہمارے ایمان (FAITH) سے ہم آہنگ ہو۔ اور جو لوگوں کو اس قابل بنا دے کہ وہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کو زندگی کے ہر شعبہ میں عملاً نفاذ پذیر کر سکیں۔

ہماری دوسری کوشش یہ ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جس میں، شروع ہی سے دینی اور دنیاوی تعلیم کا سلسلہ دوش بدوش چلے۔

اسی تقریر میں انہوں نے آگے چل کر کہا۔

اس ضمن میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن کو ماضی کے جمود اور تعطل سے آزاد کریں۔ دین کے ہر معاملہ میں دیانتدارانہ اور آزادانہ طور پر پوری پوری تحقیق کریں، اسلام پر اس انداز سے عمل کریں کہ وہ اس ایٹمی دور میں زمانے کی برق رفتاری کا ساتھ دے سکے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں جس سے ہماری آنے والی نسلیں، دینی اور دنیاوی تعلیم کے امتزاج سے نہایت اچھے

انسان اور نہایت اچھے مسلمان بن سکیں۔

ور قاہرہ یونیورسٹی کی تقریر میں فرمایا۔

جوں جوں ہم دین کی روح سے دُور ہٹتے گئے اور محض رسم پرستی کو دین سمجھ لیا، دین کی اصل وحقیقت کی جگہ سطحیت نے لے لی، غور وفکر کی جگہ توہم پرستی آگئی اور جرأت تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی اندھی تقلید نے سنبھال لی۔ مسلمانوں کو، تاج وتخت اور حکومتوں اور سلطنتوں کے چھن جانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر نقصان اس سے ہوا کہ ان سے اس دل کی حکومت چھن گئی جس کا شعار آزادانہ تحقیق وکاوش تھا اور اس کی جگہ ان پر عقلی جمود مسلط ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی۔ لیکن اسلام کا علم وعمل اس سے صدیوں پیچھے رہ گئے۔ اور وہ دین، جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ ایک مکمل، متحرک اور حرکت بخش ضابطۂ حیات بنے، محض پوجا پاٹ کی ظواہر پرستی کا پیکر بن کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس دنیا میں، جو ہر آن آگے بڑھتی جارہی ہے۔ مسلمان کی نگاہیں مُڑ مُڑ کر پیچھے کی طرف جاتی ہیں۔

ہمارے نظام تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید وجمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے اور عصر حاضر کے علم اور سائنٹیفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر، اسے آگے بڑھاتے جائیں۔

۷ نومبر کو ان کے اعزاز میں (قاہرہ میں) نیشنل یونین ریلی کا اجتماع ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا۔

ایک اور مسئلہ بھی ایسا ہے جو میرے خیال میں آپ حضرات کے ذہن رسا کے بھی ایسا ہی قریب ہے جیسا ہم پاکستانیوں کے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ترقی پسند اور متحرک دین ہے۔ یہ ایک ایسا دین ہے جو عقل وفکر اور غور وتدبر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جو ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلنا سکھاتا ہے۔ لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس دین کے ساتھ بیتی کیا ہے؟ ایک طرف اس دین کو دیکھئے اور دوسری طرف عالم اسلام پر نگاہ ڈالئے بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔ آج ساری دنیا کے مسلمان سب سے زیادہ پیچھے اور سب سے کم تعلیم یافتہ ہیں۔ کیا یہ صورت حالات ایسی تشویش انگیز نہیں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس پر غور کریں کہ اس قسم کے دین کے نام لیواؤں کی ایسی حالت کیوں ہوگئی؟ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے اور اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ہر اس مسلمان کا فریضہ ہے جسے دیدۂ بینا عطا ہوا ہے کہ وہ سوچے کہ ہمارے اس زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے، اسے بلاخوف اور بے دھڑک واضح الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کردے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ اور مذہبی راہ نماؤں نے مشکلات ومصائب کے ہجوم میں ہماری ملّی روایات کے حفظ وبقا کے لئے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں لیکن کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے ہیں، وہ اس طریق کی طرف ہماری راہ نمائی کرسکتا ہے جس سے ہم زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل ہو سکیں؟ ممکن ہے آپ اس کے جواب میں کہہ دیں کہ (i) ان کے لئے یہ بتانا کیا ضرور ہے اور (ii) ہم پر

یہ بھی کب لازم ہے کہ ہم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ قوانین فطرت اور خود قرآن کریم ہمیں واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو لوگ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتے اور زمانے کے ساتھ نہیں چلتے، آخر الامر تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، اگر ہم زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور انہیں دُور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے، تو ہم پھر دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس مرتبہ کی غلامی، سابقہ دَور کی غلامی کے مقابلہ میں، بہت زیادہ دیرپا ہوگی۔

دین کی غرض و غایت اور اسلام کی آئیڈیالوجی کو اس طرح واشگاف کرنے کے بعد انہوں نے پاکستان کا ذکر کیا اور فرمایا کہ

پاکستانی اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ان کا ملک اسلامک آئیڈیالوجی کی تخلیق ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ ہماری ہستی کی سب سے مقدم وجہ جواز ہی یہی ہے، اور اگر ہم اس آئیڈیالوجی کو بصدق دل قبول نہیں کرتے تو ہم کبھی سچے پاکستانی نہیں بن سکتے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہم حتی الامکان عصر حاضر کی سائنٹیفک تحقیقات کے ضمن میں، اسلام کا صحیح صحیح مطالعہ کریں۔

عید الاضحیٰ کی تقریر

عید الاضحیٰ (۱۹۶۱ء) کی تقریب پر، مرحوم نے، ملک کے نام ایک تقریر نشر کی جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے پورے کا پورا نقل کر دیا جائے۔ آپ نے کہا۔

عزیز ہم وطنو! عید مبارک! عید الاضحیٰ کا مبارک دن، اس عظیم الشان قربانی کی یادگار ہے جو محض اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کے لئے مکمل بے غرضی کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

اگر مسلمانوں نے اس جذبہ کی صحیح روح پر عمل کیا ہوتا تو آج دنیا میں ان کی حالت کچھ اور ہوتی لیکن قربانی کی رسم تو باقی رہ گئی اور اس کے پیچھے جو ابراہیمیؑ روح تھی وہ روایات میں کھو گئی۔ یہ حال صرف قربانی کی رسم ہی کا نہیں ہوا، بلکہ اسلام کے بہت سے دوسرے سنہری اصولوں کا بھی یہی حشر ہوا ہے۔ صدیوں سے ہم نے مذہب کو علمی زیادہ اور عملی کم بنا رکھا ہے۔ علم میں بھی ہم نے مذہب کی روح کو روایات میں جکڑ کر ماضی کا قیدی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے اکثر لوگ کتابی اسلام سے تو ضرور کچھ نہ کچھ واقف ہیں۔ لیکن مذہب کے اس پہلو سے بہت دُور ہیں جو زندگی کا لازمی حصہ ہونا چاہئے۔

ماضی کی چار دیواری

بڑھتی ہوئی تعلیم اور ترقی کے اس زمانے میں زندگی کی رفتار بے حد تیز ہو گئی ہے، اور انسان کا ذہن ان بہت سی حدود سے آزاد ہو گیا ہے جو بے علمی کی وجہ سے قائم تھیں۔ آج کا ذہن صرف اسی بات کو قبول کرے گا جو سائنس اور علم کے اس عجیب و غریب دور میں اسے مطمئن کر سکے۔ اگر ہم نے مذہب کو ماضی کی چار دیواری میں قید رکھا تو یہ خطرہ ہے کہ حال و مستقبل کے بہت سے لوگ لادینی کا شکار ہو جائیں گے۔

عزیز ہموطنو! ہم لوگ اس بات پر فخر کرنے کے عادی ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر زمانے اور ہر جائز ترقی کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن یہ دعوے صرف بیان کر دینے ہی سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو عملی طور پر بھی ثابت کر کے دکھائیں۔ اس مقصد کے لئے دو باتیں بہت لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں اور دوسرے یہ کہ اپنے زمانے اور ماحول کی روشنی میں ان پر عمل کرنے کی راہیں تلاش کریں۔

ابدی اصول کلام پاک کے اندر ہیں

جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے اسے خود اللہ تعالےٰ نے اپنے کلام پاک میں وضاحت سے بیان فرما دیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگرچہ قرآن شریف تبرک کے طور پر پڑھا اور پڑھایا تو ضرور جاتا ہے لیکن اس کو سمجھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی جاتی یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے عقائد اور عمل میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی ہے۔

اصول خواہ دینی ہوں یا دنیوی، اس لئے نہیں بنائے جاتے کہ ان کو بت بنا کر ان کی پرستش کی جائے اصول تو صرف اس لئے بنتے ہیں کہ ان پر صحیح طور پر عمل کیا جائے۔ اصول اپنی جگہ بنیادی ہوتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ لیکن اصولوں پر چلنے کے انداز ہر زمانے اور ہر ماحول کے مطابق ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو علم اور عمل الگ الگ راہوں پر چلنے لگتے ہیں اور ان میں کوئی رابطہ قائم نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر جب بجلی پیدا کرنے کا اصول ایجاد ہوا تو پہلے پہلے جو شخص ہاتھ لگاتا تھا، صرف جھٹکے لگتے تھے۔ پھر جیسے جیسے انسان کا علم بڑھتا گیا ویسے ویسے بجلی کو استعمال کرنے کے نئے طریقے بھی دریافت ہوتے گئے۔ چنانچہ آج اس بجلی سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ پنکھے چلتے ہیں۔ وائرلیس اور ٹیلی ویژن کی لہریں پھیلتی ہیں اور بڑی طاقت والے ہوائی جہاز اڑتے ہیں۔ ان سب ترقیوں کے باوجود بجلی کی حقیقت اور اس کو بنانے کے بنیادی اصول قائم ہیں اور ان میں کسی قسم کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

سنّت۔ حدیث اور فقہ

یہی حال روحانی دنیا کا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اصول ازلی اور ابدی ہیں، اور ان پر ہر زمانہ اپنے تقاضوں کے مطابق چل سکتا ہے۔ سنّت، حدیث اور فقہ، سب اس بات کا ثبوت ہیں۔ یہ سب ہمارے لئے روشنی کے مینار ہیں، جو ہمیں بتاتے ہیں کہ کس زمانہ میں اور کن کن حالات میں خدا کے احکام پر کس کس طرح عمل کیا گیا؟

روشنی کے مینار رہنمائی کے لئے ہوتے ہیں، جمود کے لئے نہیں۔ جمود تو تاریکی میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ترقی کا راز تو یہ ہے کہ ہم اسلام کے بنیادی اصولوں کو اچھی طرح سمجھیں۔ ان پر مضبوطی کے ساتھ ثابت قدم رہیں اور پھر ماضی کو مشعلِ راہ بنا کر حال اور مستقبل کی دنیا میں عمل کی نئی نئی راہیں تلاش کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اسلام تو اپنی جگہ سلامت رہے گا۔ لیکن مسلمان دنیا اور آخرت کی زندگی میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ یہ ایک بہت بڑا ظلم ہو گا۔ کیونکہ اسلام فقط اپنی ذات کے لئے زندہ رہنے کے لئے نہیں آیا۔

بلکہ اس دنیا میں بھی اور دوسری دنیا میں بھی مسلمانوں کو سربلندی کے ساتھ زندہ رکھنے کے لئے آیا ہے۔

اسلام اور پاکستان

ایک اور ضروری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اسلام کی جتنی ضرورت پاکستان کو ہے۔ اتنی کسی اور کو نہیں۔ اگر خدانخواستہ دنیا کے دوسرے ممالک اسلام سے دُور بھی ہو جائیں تو آخرت کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کم از کم اس دنیا میں ان کی قومیت اپنی جگہ قائم اور سلامت رہے گی۔ پاکستان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہمارا ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور صرف اسی نام پر یہ زندہ بھی رہ سکتا ہے۔ اسلام کے سوا ہماری قومیت اور سالمیت کی اور کوئی بنیاد نہیں۔ یہ بنیاد صرف تصوّر اور نظریہ پر نہیں بلکہ عمل پر قائم رہ سکتی ہے۔ جیسے جیسے ہمارے ایمان اور عمل میں ہم آہنگی بڑھتی جائے گی، اسی طرح پاکستان بھی مضبوط ہوتا جائے گا۔ ورنہ اگر ہمارے ایمان اور عمل میں تضاد پیدا ہوتا گیا تو یہ شدید خطرہ ہے کہ پاکستان کا وجود بھی کھوکھلا ہو کر منتشر ہونے لگے گا۔ چنانچہ اگر روحانی اور اخلاقی مقاصد کے لئے نہیں تو کم از کم اپنی قومی بقا اور سلامتی کے لئے ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھیں اور اس پر سچائی اور اخلاص سے عمل کریں۔ اسلام کا دامن مضبوطی سے تھامنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔ اس کی حکمت اور احکام پر غور کریں اور پھر اپنے نئے اور پُرانے علم کی روشنی میں وہ راستے تلاش کریں جن پر چل کر ہم آج کل کی دنیا میں ہر لحاظ سے اچھے مسلمان اور اچھے انسان بن کر رہ سکیں۔ میں آپ سے پُرزور

قرآن سمجھ کر پڑھیں

اپیل کرتا ہوں کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے آپ اپنے علم اور عمل کی ساری صلاحیتوں کو پورے طور پر کام میں لائیں۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جہاں جہاں کسی سرکاری غیر سرکاری مجلس یا تقریب میں قرآن شریف کی تلاوت کی جائے وہاں ان آیات کا آسان اور عام فہم ترجمہ بھی ضرور سنایا جائے اور پھر اس بات پر روشنی ڈالی جائے کہ ان آیات میں جو جو احکام یا اصول بیان ہوئے ہیں، آج کل کی زندگی میں ان پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام صرف ذاتی یا انفرادی طور پر نہیں بلکہ ایک منظم تحریک کے طور پر جلد از جلد شروع ہونا چاہئے تاکہ ہم اللہ تعالےٰ کے اس فرمان کی تعمیل کر سکیں، جس میں بار بار یہ تاکید کی گئی ہے کہ قرآن شریف کی آیات پر غور و فکر کرو تاکہ ان کی حکمت اور بصیرت کا نور حاصل کر سکو۔ اس سلسلہ میں عوام کے نمائندہ ادارے، مثلاً بنیادی جمہوریتوں کی مختلف کونسلیں، کارپوریشنیں۔ میونسپل کمیٹیاں۔ وغیرہ بہت بڑا کام کر سکتی ہیں۔ میں ان سب سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ باضابطہ پروگرام بنا کر وسیع پیمانہ پر اس تحریک کو شروع کریں۔ تاکہ سکولوں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے علاوہ۔ ہر گاؤں۔ ہر گلی۔ ہر محلہ میں قرآن پاک کے درس جاری ہو جائیں۔ جن میں قرآن پاک کی تعلیم، اور اس تعلیم پر عمل کے طریقوں پر خاص طور سے زور دیا جائے۔ جہالت اور گمراہی کے خلاف یہ ایک ایسا جہاد ہے جس میں ہر مسلمان کو ایک جانباز سپاہی کی طرح شامل ہونا چاہئے۔ خاص طور

پر اس طبقہ کو بھی اس طرف توجہ دینی چاہئے جو تعلیم یافتہ اور مہذّب ہے۔ اور جسے ہم باشعور طبقہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ تاکہ مذہب کو ایک دقیانوسی چیز سمجھ کر اس کا مذاق اُڑانے کا فیشن ختم ہو جائے۔ اور یہ طبقہ پاکستان کی آزادی اور نصب العین کی حفاظت اور رہنمائی کر سکے۔ اگر ہم نے غفلت سے کام لیا اور خدا کے بتائے ہوئے صراط مستقیم کی صحیح طور پر تلاش نہ کی تو مجھے ڈر ہے کہ ہمارا روحانی۔ اخلاقی۔ مادی اور قومی وجود انتہائی خطرہ میں پڑ جائے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ میری اپیل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں ـــــ خدا آپ کا مددگار ہو۔

مفتی صاحب کے خط کے جواب میں

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے مرحوم کو عائلی قوانین کے سلسلہ میں ایک خط لکھا تھا جس کے جواب کے آخیر میں انہوں نے (جون ۱۹۶۱ء میں لکھا کہ۔

اصولوں سے انحراف تو قطعی ناممکن ہے۔ لیکن ان پر عمل کے طریق کار کو تقاضائے وقت کے ساتھ ساتھ وضع کرنا صرف حکومت کا ہی نہیں بلکہ خود علمائے کرام کا بھی فرض ہے۔ اس بات کو میں "فرض" اس لئے کہتا ہوں کہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم حال اور مستقبل کے دَور میں زندگی کو لادینی کے غار سے بچا سکتے ہیں۔

نئے طریق کار

ایک سیدھے سادے مسلمان کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ سُنّت، حدیث اور فقہ کی روشنی میں ہمیں عمل کے ایسے طریق ہائے کار وضع کرنے پڑیں گے جو آج کل کی دُنیا میں قابلِ عمل، اور موجودہ اذہان کے لئے قابل قبول ہوں۔ اگر ہم نے اس میں کوتاہی کی تو ہم خود زندگی اور مذہب کے درمیان ایک گہری خلیج حائل کرنے کے مجرم ہوں گے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی مروّجہ روش سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ بات ان طبقوں پر بہت گراں گزرتی ہے جو اس کے عادی ہو چکے تھے۔ یا جن کے لئے وہ روش کسی قسم کے ذاتی یا جماعتی منفعت یا وقار کی باعث تھی لیکن سچّے جذبۂ خدمت کا یہی تقاضا ہے کہ ایسی ذہنی یا نفسیاتی رکاوٹوں کو ترقی کی راہ کا روڑا نہ بننے دیا جائے۔

سینٹ پیٹرک اسکول

۳۰ جولائی ۱۹۷۱ء کو، کراچی کے سینٹ پیٹرک اسکول کی صد سالہ برسی کی تقریب پر مرحوم نے ایک تقریر فرمائی تھی۔ اس سے پہلے، اسکول کے پرنسپل صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہمیں روایات کی شدت سے پابندی کرنی چاہئے۔ انہوں نے اس نکتہ کے متعلق فرمایا۔

واجب الاحترام پرنسپل صاحب نے اپنی تقریر میں ایک ایسا اصولی نکتہ بیان فرمایا ہے جس کے متعلق میں کچھ گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے۔

"ہمیں روایات (TRADITIONS) کا بہت زیادہ احترام کرنا چاہئے، اور مستقبل کی خاطر اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے۔ آج کل یہ رجحان عام طور پر پایا جاتا ہے کہ لوگ زمانے کے تقاضوں سے مانوس، اپنے ماضی کا مذاق اُڑاتے ہیں، اور اس بات کا بھی اُنہیں علم نہیں ہوتا کہ وہ مستقبل میں اخلاقی اور روحانی بنیادوں کے معنی کیا کریں۔"

یہ بڑا بنیادی نقطہ ہے۔ یہ درحقیقت ایک اہم بنیادی مسئلہ ہے جو عام مذاہب کو بالعموم، اور عیسائیت اور اسلام کو بالخصوص درپیش ہے۔ پاکستان میں ہمیں خصوصیت سے اس اہم مسئلہ کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہماری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس سے پیشتر، جبکہ زندگی یعنی معاشرہ، جامد تھا، متحرک نہیں تھا۔ ایسا ممکن تھا کہ آپ آنکھیں بند کئے، قدیم روایات کے مطابق چلتے جائیں۔ اور زندگی کو انہی کے قالب میں ڈھالے رکھیں۔ اُن حالات میں یہ طرزِ عمل صحیح قرار پا سکتا تھا۔ لیکن اب، جبکہ لوگوں میں تعلیم عام ہو رہی ہے ـــــ اور پاکستان میں آئندہ پندرہ بیس سال میں تعلیم بالکل عام ہو جائے گی ـــــ حالات اس سے بالکل مختلف ہو چکے ہیں۔

تعلیم کے معنی کیا ہیں؟ اس سے انسانوں میں کیا تبدیلی واقع ہوتی ہے؟ میرے نزدیک، تعلیم، انسان میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنے لئے آپ سوچے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب انسان خود سوچنے لگ جائے، تو اُس وقت محض کتب مقدسہ اور روایات کے حوالوں سے کام نہیں چل سکتا۔ اس وقت ضروری ہوگا کہ آپ مذہب اور فلسفۂ مذہب کے اصولوں کو پیش کرنے کے انداز میں تبدیلی پیدا کر دیں، اور انہیں اس زبان میں پیش کریں جو اُس زمانے کے سوچنے والے انسانوں کی سمجھ میں آسکے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ بیشک آپ قدیمی روایات کا احترام کریں اور یہ سمجھ لیں کہ کسی خاص زمانے کے لئے وہ کس قدر مفید تھیں، لیکن آپ اپنے آپ کو اُن روایات کے ساتھ باندھ نہ لیں۔ اگر آپ نے اپنے آپ کو روایات کے ساتھ باندھے رکھا، تو زمانہ آپ کا انتظار نہیں کرے گا۔ وہ اپنی رفتار سے آگے بڑھتا جائے گا۔ لہٰذا، عیسائیت اور اسلام جیسے مذاہب کے لئے سوچنے کا مقام ہے کہ انہیں زمانے کا ساتھ دینے کے لئے ـــــ یعنی ان لوگوں کے نفسیاتی ذہنی اور روحانی تقاضوں کی تسکین کے لئے جو آج کل دنیا میں پیدا ہو رہے ہیں ـــــ کیا کرنا چاہئے؟

میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ، تمام اچھے مذاہب کی طرح، ان کے ہاں مذہب کے کچھ اصول ہیں اور باقی وہ طریقے ہیں جن کے مطابق ان اصولوں کو (زمانے کے تقاضوں کے مطابق) عمل میں لایا جاتا ہے۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں۔ زندگی کے بنیادی اصول آج بھی وہی ہیں جو آج سے سینکڑوں، ہزاروں سال پہلے تھے لیکن اُن پر عمل کرنے کے طریقے بدل چکے ہیں۔ ہمیں اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لینا چاہئے۔ آپ ان غیر متبدل اصولوں کو الگ کر لیجئے۔ اُنہیں ناقابلِ تغیر و تبدل قرار دیجئے۔ اور پھر معاشرہ کو اس کی آزادی دیجئے کہ وہ ان اصولوں کو، دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق، عمل میں لانے کی تدابیر اختیار کریں۔ اگر ان مذاہب نے ایسا نہ کیا تو یہ ڈوب جائیں گے اور کمیونزم ان پر کُلی طرح مسلط ہو جائیگا۔

ہم نے گذشتہ چالیس سال میں دیکھا ہے کہ کمیونزم، بدھ مت اور عیسائیت کے سامنے آئی لیکن یہ مذاہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ اب ہماری باری آرہی ہے۔ اگر ہم بھی بیدار نہ ہوئے تو ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو ان مذاہب کا ہوا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ رازِ حیات اسی اصول میں مضمر ہے (جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔) جو لوگ (کمیونزم کے سیلاب میں بہ جانا نہیں چاہتے بلکہ) اپنے روحانی اور اخلاقی ضوابط کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، انہیں ایسا کرنا ہوگا۔ اور جو لوگ مذہبی امور میں ماہر ہیں، انہیں اس

باب میں، دوسرے لوگوں کی راہ نمائی کرنی ہوگی۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو آپ زمانہ کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ مادہ پرستی کا سیلاب اُمنڈ آئے گا اور آپ لوگوں کو کبھی اس پر مجبور نہیں کر سکیں گے کہ وہ آپ کی نہج پر سوچیں۔

محترم پادری صاحب! میں نے جو کچھ کہا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے نقطۂ نگاہ کے مطابق نہ ہو، لیکن میں چاہتا تھا کہ آپ کے سامنے تصویر کا دوسرا رُخ بھی لے آؤں، اور اپنا نقطۂ واضح کر دوں۔ اس کی ضرورت خاص طور پر اس لئے بھی پیش آئی کہ آجکل پاکستان میں ہمارے سامنے یہی مسئلہ درپیش ہے، اس لئے یہ ہر وقت میری نگاہوں کے سامنے رہتا ہے۔ میں علوم دینیات کا ماہر نہیں ہوں لیکن عمومی فکر کی رُو سے جب میں اس پر غور کرتا ہوں تو میرے سامنے اس مسئلہ کا حل یہی آتا ہے کہ ہمیں غیر متبدل اصولوں کو (بدلنے والے طریقوں سے) الگ کر لینا چاہئے۔ لوگوں کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ غیر متبدل اصول کیا ہے۔ اس کے بعد انہیں اس کا موقع دینا چاہئے کہ وہ ان غیر متبدل اصولوں کو، اپنے زمانے کے مطابق عمل میں لانے کی تدابیر اختیار کریں۔

اگر آپ نے ایسا کر لیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس قسم کا غیر متبدل اور محیر العقول مذہب کامیاب و کامران نہ ہو۔

۲۵ ستمبر ۱۹۶۱ء

کو، کراچی میں، بنیادی جمہوری اداروں کی خواتین کی طرف سے، ایک سپاسنامہ کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے مرحوم نے فرمایا۔

قرآن کریم نے ہمیں جو بنیادی اصول دیئے ہیں وہ ابدی ہیں لیکن ان کی تشریح وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ہونی چاہئے اور معاشرہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مقتضیات زمانہ کے مطابق ان پر عمل کرے .... (یاد رکھئے) صرف وہی قومیں زندہ رہ سکتی جن میں عقل و استدلال سے کام لینے کی بصیرت موجود ہے۔

یوم انقلاب ۱۹۶۱ء

انہوں نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء کی شام، ملت کے نام، اپنے پیغام میں فرمایا۔

جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے، ہمارے آئین کا بنیادی پتھر اسلام کی روح ہوگا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اسی کی خاطر اسے حاصل کیا۔ ہماری بقا اور فلاح کا راز، اسی اسلامی روح کے ساتھ دیانتداری سے تمسک میں ہے ..... ہمارے مملکتی نظم و ضبط، بلکہ ہماری پوری زندگی میں اسلام ہی ہمارا پیش نہاد ہے اور میری کوشش یہ ہے کہ میں کم از کم ایک ایسی مشینری کی بنیاد رکھ دوں جو ہمارے ایمان کی روح کو کشید کر کے، اسے ہماری عملی زندگی میں پھونک دے جس سے ہمیں روشنی اور ہدایت اور فلاح و سعادت نصیب ہو۔

اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے، کہ دین کے بنیادی اصولوں کے سوا، انسانی معاملات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ناقابل تغیر و تبدل ہو۔

جامعہ بہاولپور

انہوں نے ۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی افتتاحی تقریب پر کہا :-

ملک کے مستقبل کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے مذہبی ادارے صحیح خطوط پر منظم کئے جائیں۔ پاکستان اسلام کی بنیاد

پر قائم ہوا تھا ہم نے اپنے مذہب کے تحفظ کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں دولتِ پاکستان سے نوازا۔ شاید عالمِ اسلام میں پاکستان کے عوام کا مذہب سے زیادہ لگاؤ ہے۔ گذشتہ صدی میں ہمارے علماء کا خیال تھا کہ اسلام کے تحفظ کے لئے مسلمانوں کو انگریزی اور جدید سائنس کی تعلیم سے محروم رکھنا ضروری ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا سچا مذہب ہے۔ اس کے اصول سچے اور ہر زمانے کے لئے ہیں۔ اس لئے اسے جدید تعلیم یا نئے نظریات سے قطعاً کوئی خطرہ نہیں۔ خوف تو اس چیز کو ہونا چاہئے جو جھوٹی اور بزدل ہو۔ جو لوگ سچائی پر ہیں انہیں جدید سائنس یا نظریات سے قطعاً کوئی خوف نہیں ہونا چاہئے۔ نئے نظریات اور جدید سائنس کا مقابلہ کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ ہم اپنے علم کی حدود کے اندر ہی رہیں۔ اور بیرونی اثر و نفوذ سے بالکل قطع تعلق کر لیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم جدید علوم اور نظریات کا مطالعہ کریں۔ ہمارا مذہب ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم جہاں بھی کوئی اچھائی یا خوبی دیکھیں اسے اپنا لیں۔ اور بُرائی کو رد کر دیں۔ قرآن اور سنّت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے جدید علوم اور نظریات سے خطرہ لاحق ہو۔ اگر موجودہ وقت کے ہمارے علماء کوئی ایسا فتویٰ دے دیتے ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں ہمیں صحیح معلوم نہیں ہوتا تو ہمیں وہ راستہ اختیار کرنے سے کوئی ڈر نہیں ہوتا جسے ہم صحیح سمجھتے ہوں۔ قرآن حکیم میں بار بار کہا گیا ہے کہ ہم اپنی عقل اور دانش سے کام لیں۔ علاوہ ازیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اجتہاد کے دروازے کھولے ہیں۔ اگر ہم نے تنگ نظری کا ثبوت دیا اور فرسودہ طریقے اپنائے رکھے تو ہماری مستقبل کی نسلیں اسلام سے اسی طرح دُور ہو جائیں گی جس طرح مغربی اقوام اپنے مذہب سے دُور ہو گئی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمارے مذہبی رہنماؤں اور علماء کا اخلاقی۔ قومی اور مذہبی فرض ہے کہ وہ اسلام کے اصولوں کو دورِ جدید کی ضروریات پر منطبق کر کے ثابت کریں کہ یہ اصول سچے اور ہر زمانے کے لئے ہیں۔ فرسودہ نظریات سے جو بدلے ہوئے حالات میں کسی کام کے نہیں ہیں۔ سختی سے وابستگی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہماری آئندہ نسلیں مذہب سے دُور ہو جائیں گی اور اُنہیں خوفِ خدا نہیں رہے گا۔ اسلام ایک ترقی پسند مذہب ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ نے جو عظیم کامیابی حاصل کی وہ اسلام کے اصولوں کی سختی سے پابندی کا نتیجہ تھی۔ اُنہوں نے زندگیوں کا آغاز غیر مہذب لوگوں میں کیا۔ لیکن وہ آرٹ، ادب اور سائنس کے ماہر اور دنیا کے رہنما بن گئے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسی اسلام کے پیروکار آج پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے نقشِ قدم پر نہیں چل رہے۔ ہم نے اسلام کے اصولوں کو ترک کر دیا ہے اور صرف اسلامی فقہ کو ہی اسلام سمجھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک بار پھر عوام میں اسلام کی صحیح روح پیدا کی جائے۔

دانشورانِ کراچی سے خطاب

مئی ۱۹۶۴ء میں مرحوم کراچی تشریف لے گئے تو اُنہوں نے وہاں کے اربابِ علم و فکر کو اپنے ہاں مدعو

کیا اور ایک مختصر سی شستہ مجلس میں ان سے تبادلۂ خیالات کیا جس کے دوران انہوں نے کہا۔

لوگ فرسودہ خیالات سے چمٹے اور پامال راستوں پر آنکھیں بند کرکے چلتے رہنے کے عادی ہو چکے ہیں اور ہر تبدیلی کو شک و شبہات اور بدظنی کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہ سب اس لئے کہ "جیسا ہوتا چلا آرہا ہے ویسے کرتے چلے جانے" میں بڑی حد تک آسانی اور سہل نگاری ہوتی ہے اور ان راستوں سے ہٹ کر نئی راہیں تلاش کرنے میں بڑی مشقت درکار۔ لیکن اگر ہمیں ترقی کرنی ہے تو ہمیں فرسودہ اور پامال راستوں کو چھوڑنا ہوگا۔ اگر ہم نے ان خیالات کو نہ چھوڑا جن سے ہم محض اس لئے چمٹے ہوئے ہیں کہ وہ صدیوں سے متوارث چلے آرہے ہیں تو ہم کبھی اس رفتار سے ترقی نہیں کر سکیں گے جس رفتار سے ہمیں ترقی کرنی چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں دنیائے فکر میں زیادہ سے زیادہ "باغی اور ملحد" پیدا ہوں۔

افریشیائی سیمینار، لاہور

شروع فروری ۱۹۶۴ء میں، لاہور میں، ایک بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی مجلس مذاکرہ (سیمینار) کا انعقاد ہوا جس میں افریقہ اور ایشیا کی بہت سی اقوام کے نمائندگان شامل تھے۔ اسی جہت سے اسے "افریشیائی سیمینار" کے مختصر نام سے پکارا گیا تھا۔ مرحوم نے اس مجلس مذاکرہ کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے خطبہ افتتاحیہ میں بعض ایسے اہم نکات پیش کئے جو آج بھی ارباب دانش و بصیرت کے لئے درخورِ غور و فکر ہیں۔ انہوں نے کہا۔

ہم اپنی آزادی سے کیا فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کا مدار اس بات پر ہے کہ فکر و شعور کی دنیا میں ہمارا طرزِ عمل کیا ہے۔ اس لئے کہ جو عمل کسی قوم کو ترقی کی راہوں پر لے جا سکتا ہے اس کے محرک ہمیشہ افکار و تصورات ہوتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے قدیم و جدید کی کشمکش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

ہم میں سے جو لوگ قدیم تہذیب کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں، وہ بعض اوقات اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ تہذیب مغرب کی کشش و جاذبیت کے مقابلہ کرنے کا طریقہ یہ ہے — یعنی اس تہذیب کی صنعت گری کا مقابلہ کرنے کا جس کی بنیاد سائنس اور ٹیکنالوجی، علم الاشیاء، پر ہے — کہ ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند کرکے اپنے ماضی کے گھروندے میں سر دے کر بیٹھ جائیں (لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ) جس آسانی سے آج کل انسانی خیالات اور خود انسان، ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں اس کے پیش نظر کسی کا اپنے آپ کو ان خیالات سے غیر متاثر رکھنا بہت مشکل ہے۔ اب کوئی ملک بھی دنیا کے عالمگیر مؤثرات و تحریکات سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جو بات اچھی نظر آئے اسے اپنایا نہ جائے، خواہ وہ کہیں سے ملے، اور جو نا خوشگوار ہو اسے مسترد نہ کر دیا جائے۔ ہمارا فائدہ اسی میں ہے کہ ہم اپنی تہذیب و تمدن کے بنیادی عناصر کو قائم رکھتے ہوئے ان میں، اور ان ترقی پذیر عناصر میں امتزاج پیدا کریں، جو دوسری تہذیبیں پیش کریں۔ یہ بات صرف اسی قسم کے امتزاج ہی سے ممکن ہے کہ ہم ایک طرف اپنی انفرادیت اور تشخص کو برقرار رکھ

سکیں اور دوسری طرف اپنے لوگوں کو اس کے لئے تیار کر سکیں کہ وہ عصر حاضر کے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اُتر سکیں تاکہ ہم اس قابل ہو سکیں کہ ہم اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکیں۔ اپنا معیار زندگی بلند کر سکیں اور اپنی قوم کو ایسی زندگی عطا کر سکیں جو افراد معاشرہ کو طبعی ضروریاتِ زندگی کی احتیاج اور ذہنی جمود سے نجات دلا سکے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

(زندگی کے گہوارے میں) افراط و تفریط کی طرف چلے جانا بڑا آسان، اور ایک خوشگوار اعتدال کو قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے، جو لوگ ماضی میں کھوئے رہنا پسند کرتے ہیں، وہ افکارِ نو اختیار کرنے کی مشقتوں سے گھبراتے ہیں۔ یہ عام انسانی فطرت ہے۔ نئے افکار اور جدید قالب، وضعِ حمل کے سے درد اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ — دردِ زہ کے بغیر بچہ پیدا نہیں ہوتا — دوسری طرف وہ لوگ جو اپنے ماضی سے یکسر منہ موڑ لیتے ہیں وہ ندی کے چڑھاؤ کی طرف جانے کے بجائے، اس کی عام لہروں کے ساتھ بہ جانے میں آسانی دیکھتے ہیں۔ جو قومیں اپنی زندگی کے دورِ جدید میں داخل ہو رہی ہیں، جہاں ان کے لئے اپنی آزادی کا برقرار رکھنا ضروری ہے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل میں آزاد ہوں۔

اس کے بعد انہوں نے اس نکتہ کو بیان کیا ہے جو اس باب میں محوری اور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا:-

مذہب کے میدان میں یہ دقت خصوصیت سے پیش آتی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور کے ساتھ اُس کی مطابقت کیسے کی جائے۔ اکثر مذاہب میں، رسوم اور ظواہر کے دھندلکوں میں چھپے رہنے کا رجحان پایا جاتا ہے اور ان کے علمبردار، عصر سائنس کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے تصور پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہماری نئی پود مذہب سے دُور بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ میں مذہبی امور کا ماہر نہیں۔ لیکن یہ میرا پختہ ایمان ہے کہ مذہب کے بنیادی اصول مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ نہ ہی ان میں تبدیلی کرنی چاہئے۔ لیکن ان اصولوں کا اطلاق زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ہونا چاہئے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے مذہب کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑے گی اور اس کے متبعین، ترقی اور مسابقت سے ہمدوش رہیں گے۔

علاوہ بریں انسان فطرۃً روایت پرست واقع ہوا ہے۔ اور ایک حد تک یہ ٹھیک بھی ہے۔ اس لئے کہ اس سے ان کا تعلق ماضی کے ساتھ اس طرح وابستہ رہتا ہے کہ وہ حال کے معاملات کو سنبھالنے اور مستقبل کے لئے تیار ہو جانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ لیکن روایت پرستی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک روایت پرستی جمود سے پیدا ہوتی اور بزدلی پر پرورش پاتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کی بنیاد اس احساس پر ہوتی ہے کہ یہ ایک بہتر زندگی کی طرف لے جانے میں ممد و معاون ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی روایت پرستی ہے جس سے ہمیں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی بڑی ضرورت ہے اس لئے کہ یہ

اس جذبہ کی پیداوار ہے کہ انسان اپنی فکری صلاحیتوں سے قطعاً کام نہ لے، حالانکہ یہ فکری صلاحیت ہی ہے جس کی رو سے انسان، دیگر حیوانات سے ممیز اور ممتاز ہوتا ہے۔ یہ امر موجب حیرت ہے کہ اکثر انسان اس صلاحیت سے کام لینے سے نفرت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں تاریخ انسانیت میں یہ (تعجب انگیز اور افسوسناک) منظر دکھائی دیتا ہے کہ جن لوگوں نے (تقلید کی برفانی سلوں کو توڑ کر) فکر و خیال کی نئی راہیں تراشنے کی جرات کی، دوسرے لوگوں نے ان کی سخت مخالفت کی اور انہیں متشدد و تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ انہیں کافر، مرتد اور ملحد و بے دین قرار دیا گیا۔ لیکن ان میں سے جن افراد نے مثبت اور تعمیری فکر پیش کی تھی، مرجانے کے بعد وہ بڑی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں اپنے ارباب فکر و دانش کی "پرستش" اُس وقت کرنی چاہیئے جب وہ ہنوز زندہ ہوں۔ اور اس طرح ان کی فکری استعداد سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

مجلس تزئین القرآن - راولپنڈی

جولائی ۱۹۶۶ء میں انہوں نے 'مجلس تزئین القرآن' 'راولپنڈی' کا افتتاح کرتے ہوئے اس حقیقت کو ایک بار پھر دہرایا کہ۔

پاکستان ایک ایسی مملکت ہے جس کی بنیاد اسلامک آئیڈیالوجی پر ہے حقیقت یہ ہے کہ ہماری جداگانہ ہستی کی واحد بنیاد یہ ہے کہ ہم نے اس امر کا تہیہ کر لیا کہ ہم اپنی اسلامی قوانین کے مطابق اپنی تشکیل جدید کریں گے۔ بحیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید خدا کی کتاب ہے اور ہماری مادی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات - یہ 'بندوں کے بندوں کے ساتھ' اور خدا کے بندوں کے ساتھ تعلقات وابستہ کرنے کے ضوابط ہی متعین نہیں کرتی، بلکہ ایک مبنی بر انصاف مملکت کے لئے اصول حکومت بھی عطا کرتی ہے۔ اس میں معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے انفرادی اور اجتماعی کوششوں پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ نیز اس میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق علوم حاصل کرنے کی بڑی تائید کی گئی ہے۔ قرآن نے قدیم فلسفیانہ نظریات، غیر اسلامی مذہبی عقاید اور عصر حاضر کے مادیانہ تصورات کا بڑی عمدگی سے مقابلہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جو بنیادی اصول دیئے گئے ہیں وہ غیر متبدل ہیں اور مسلمانوں نے ہر زمانے میں، اسے محفوظ رکھنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔

ایسا کیوں ہے؟

مارچ ۱۹۶۷ء کے طلوع اسلام میں ہم نے "ایسا کیوں ہے؟" کے عنوان سے ایک مختصر سا شذرہ لکھا تھا جسے، موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے، یہاں دہرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وھو ھذا۔

ہمارے صدر محترم، محمد ایوب خان نے، اسلام کے متعلق جب اور جہاں بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ وہ دین کی اصل و حقیقت کو نہایت عمدگی سے سمجھتے ہیں اور اس کے مقصد و غایت پر بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ عسکری انقلاب کے بعد، مختلف مواقع پر ان کے بیانات اور مشرق وسطیٰ کے دورے کے سلسلہ میں ان کی بلیغ اور بصیرت افروز تقاریر

(جنہیں طلوع اسلام وقتاً فوقتاً سامنے لاتا رہتا ہے) اس حقیقت کی زندہ شہادات ہیں۔ اسی سلسلہ میں ہمارے سامنے ان کی وہ فکر انگیز تقریر آتی ہے جس سے انہوں نے حال ہی میں (کراچی میں) بین الاقوامی محفل قرأت کا افتتاح کیا تھا۔ اس میں انہوں نے فرمایا۔

قرآن کریم کی خوش الحانی سے قرأت ہمیشہ ایک فن (آرٹ) تصور کی جاتی رہی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرأت کے اصول خاص اہمیت کے حامل رہے ہیں، لیکن ان کی حیثیت "فن برائے فن" کی نہیں رہنی ہی اسے ایسا ہونا چاہئے۔ یہ ایک بلند اور واضح مقصد کے حصول کا ذریعہ رہا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ خدا کے کلام کو ایسے حسین اور جاذب انداز سے پیش کیا جائے کہ اس کی جاذبیت اور اثر انگیزی میں اضافہ ہو۔

قرآن کریم کی اثر انگیزی داخلی اور خارجی دونوں طرح کی ہو سکتی ہے (حسن قرأت اس کی خارجی اثر انگیزی کا موجب ہے۔ لیکن) اگر حسن قرأت تھوڑے سے وقت کے لئے انسان کے ذوقِ سماعت کی تسکین کا سامان بن کر رہ جائے تو اس سے اس کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ یہ ضروری ہے کہ ذوق جمالیات کی تسکین کے ساتھ، قرآن کے مطالب و معانی دل کی گہرائیوں میں اس طرح اتر جائیں کہ اس کے احکام پر عمل کرنے کی آرزو اور استعداد میں اضافہ ہو جائے۔

اسلامی تاریخ کا سب سے اہم سبق یہ ہے کہ جس طرح علم بلا عمل، اور عمل بلا علم ناقص اور ناتمام رہتا ہے، اسی طرح دین اور دنیا بھی ایک دوسرے سے الگ رہ کر ناقص و نامکمل رہتے ہیں جب اسلامی تہذیب و تمدن اپنے اوجِ کمال پر تھے تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت اسلام کی روح اور زمانے کے تقاضوں میں نہ کوئی تضاد تھا نہ تخالف۔ اُس وقت، مذہب اور زندگی، دو الگ الگ شعبے نہیں تھے اس کے برعکس، اس وقت مذہب کا مقصد انسان کی زندگی کو حسین و سادہ و خوشگوار بنانا تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ صورت حالات بدل گئی اور مذہب اور دنیا دو الگ الگ دائروں میں بٹ گئے ان میں نہ صرف بُعد پیدا ہو گیا بلکہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم مذہبی نقطۂ نگاہ سے اپنی ترقیوں کی بلندیوں کا اندازہ لگانا چاہیں تو ہمیں ماضی کی طرف لوٹنا پڑتا ہے لیکن اگر ہم مادی ترقی کرنا چاہیں تو ہماری نگاہیں مستقبل کی طرف اُٹھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے مذہبی اور غیر مذہبی (سیکولر) طبقوں میں ہم آہنگی کے بجائے انتشار، تعاون کے بجائے تضاد، اور اعتماد کے بجائے عدم اعتماد پایا جاتا ہے۔

اگر یہی صورتِ حالات جاری رہی تو خدشہ ہے کہ کہیں زندگی اور مذہب کا رشتہ اور زیادہ کمزور نہ ہو جائے۔ آج دنیائے سائنس میں ٹیکنالوجی اور ذہنِ انسانی کی صلاحیتیں بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہیں۔ اگر مذہب نے وقت کے تقاضوں کو پورا نہ کیا، تو (یاد رکھیئے!) ہماری مذہبی اور مادی زندگی میں اتنا بڑا خلا پیدا ہو جائے گا جسے پُر ہی نہیں کیا جا سکے گا۔

ان حالات کے پیشِ نظر ہمارے مذہبی اور سیکولر ارباب علم کے سر پر ایک عظیم ذمہ داری عاید ہوتی

ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے علم اور عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ اسلام فی الواقعہ ایک ایسا مکمل دین ہے جو ہر زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ ثبوت، نہ تو ماضی کی درخشندہ روایات کو دُہراتے رہنے سے بہم پہنچ سکے گا، اور نہ ہی مناظروں اور مباحثوں سے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دین کے بنیادی تصورات کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد علمی تحقیق اور فکری کاوش کو خاص اہمیت دی جائے تاکہ اس دَور میں ـــ جو سائنس کے انکشافات کا دَور ہے ـــ دل اور دماغ کے پورے اطمینان اور یقین کے ساتھ دین کو قبول کیا جا سکے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ موجودہ تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ مذہب سے یکسر برگشتہ ہو جائے گا اور (خدانہ کردہ) اسلام کا بھی وہی حشر ہوگا جو عیسائیت کا ہوا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ اس تقریر میں صدر محترم نے دین کی حقیقت اور اسلام کی غرض و غایت کو کیسے بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ اس خطرہ کو بھی کس شدّتِ احساس کے ساتھ سامنے لائے ہیں کہ اگر ہم نے مذہب کو زمانے کے تقاضوں سے اسی طرح الگ رکھا جس طرح اسے اب رکھا جا رہا ہے تو اس کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوگا۔

صدر محترم نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے ایک لفظ سے بھی اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ ہم انہیں ان کی اس بالغ نگہی اور حق گوئی پر مستحق تبریک و تحسین قرار دیتے ہیں۔ لیکن انہوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حالات کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے اور اس کی اصلاح کی صورت کیا ہے؟

اس وقت ملک میں تعلیم کے دو مراکز ہیں۔ ایک مذہبی مدرسے اور دار العلوم جن میں طالب علموں کو "دنیا" سے بیگانہ رکھا جاتا ہے، اور دوسرے ہمارے اسکول اور کالج، جن میں طلباء دین سے ناآشنا رہتے ہیں۔ یہ ہیں تعلیم کے دو الگ الگ دوائر جن کا نتیجہ "دین اور دنیا" میں وہ بُعد و تضاد اور عدمِ اعتماد و انتشار ہے۔ جس کی طرف صدر محترم نے باچشمِ نم اشارہ کیا ہے۔ اس بُعد اور ثنویت (DUALISM) کی ذمہ دار خود ہماری حکومت ہے۔ وہ ایک طرف مذہبی مکاتب اور دار العلوموں کی اس قدر حوصلہ افزائی اور امداد کرتی ہے کہ ان کا دائرہ اثر و نفوذ دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ہمارے اسکول اور کالج ہیں، جن کا نصابِ تعلیم ایسا ہے جس سے طالب علم، دین کی غایت و حقیقت سے یکسر بیگانہ رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جو کچھ انہیں اسلام کے نام سے پڑھایا جاتا ہے اس سے، دین سے جاذبیت پیدا ہونے کی بجائے، ان کی نفرت اور بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا جس مہیب خطرہ کی طرف صدر محترم نے قوم کی توجہ مبذول کرائی ہے، اس خطرہ کی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) خود حکومت ذمہ دار ہے۔

طلوع اسلام گذشتہ بیس برس سے، مسلسل چلّا رہا ہے کہ ملک سے، تعلیم کی اس دوعملی کو ختم کیا جائے۔ مذہبی مکاتب اور دار العلوموں کو بند کر دیا جائے اور اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کے نصاب میں اس طرح تبدیلی کی جائے کہ طالب علم، علوم دنیاوی کے ساتھ ساتھ دین کی اصل و حقیقت سے بھی آشنا ہوتے

چلے جائیں اور اس طرح وہ اپنی ارضی زندگی کو سماوی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرکے، صحیح اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کرسکیں۔ دوسری طرف، قوم کو اس انتشار و خلفشار سے نجات مل جائے جو مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں سے وبا کی طرح پھوٹ کر ملک کے امن کو خطرے میں ڈالتے رہتے ہیں۔ طلوع اسلام نے مسلسل و متواتر حکومت کی توجہ اس خطرہ کی طرف مبذول کرائی۔ لیکن حکومت نے اس سے بے اعتنائی برتی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس خطرہ کے متعلق صدر محترم کو خدشہ ہے کہ وہ کہیں پیدا نہ ہو جائے، وہ پیدا ہو رہا ہے۔ ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں متنفر ہو رہا ہے اور مذہب پرست طبقہ وہ پوزیشن حاصل کئے جا رہا ہے جو ازمنہ مظلمہ میں یورپ میں، احتساب (INQUISITION) کے علمبردار، پادریوں نے حاصل کر لی تھی اور جس کے بعد عیسائیت کو وہاں کی عملی زندگی سے دیس نکالا مل گیا تھا۔

ہم صدر محترم کی خدمت میں بصد ادب گزارش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جہاں فکر بلند اور قلب حساس کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ وہاں آپ کو مملکت کے وسیع ترین اختیارات بھی حاصل ہیں۔ آپ اگر ان تینوں چیزوں کو یکجا کرکے، تھوڑی سی ہمت کرلیں تو آپ یقیناً اسلام کو اس تاسف انگیز انجام سے بچا سکتے ہیں جو انجام عیسائیت کا ہوا ہے۔ اس سے آپ کا نام اس دنیا میں بھی تاریخ کے اوراق پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائیگا۔ اور آخرت میں بھی اسلام، آگے بڑھ کر، آپ پر تہنیت و تبریک کے پھول نچھاور کرے گا۔

شکریہ

ہم نے مارچ ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں، محترم صدر مملکت کی خصوصی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرائی تھی کہ ملک کے نظام تعلیم میں جو، دوعملی پائی جاتی ہے ـــــ وہ دوعملی جس کی رُو سے مذہبی تعلیم مکتبوں اور دارالعلوموں میں دی جاتی ہے اور "دنیاوی" تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں ـــــ اس سے قوم کی زندگی میں وہ ثنویت پیدا ہو رہی ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اس سے پاکستان کی سالمیت مخدوش ہو رہی ہے۔ کیونکہ پاکستان کی تو بنیاد ہی اس نظریہ پر تھی کہ اسلام کی رو سے "دین اور سیاست" میں کوئی بُعد نہیں۔ یہ دونوں ایک ہیں۔ ہم نے گزارش کیا تھا کہ حکومت اس ثنویت کو ختم کرنے کے لئے مناسب اقدام کرے۔

مقام شکر ہے کہ صدر محترم نے اس ضرورت کا شدید احساس فرمایا۔ چنانچہ انہوں نے لاہور اور ڈھاکہ میں اساتذہ کی کانفرنسوں میں اس خطرہ کو دہرایا۔ انہوں نے ڈھاکہ میں فرمایا۔

> یہ امر موجب تشویش ہے کہ ملک میں دو قسم کا نظام تعلیم رائج ہے۔ ایک بالکل مذہبی، دوسرا ایکسر سیکولر۔ یہ اسلام کے خلاف ہے، جو دینی اور دنیاوی اقدار کو یکجا کرنے کے لئے آیا تھا۔ اگر یہ ثنویت جاری رہی تو خطرہ ہے کہ ملک کا بیشتر تعلیم یافتہ طبقہ دین سے بیگانہ ہو کر دوسرے نظریات حیات کی طرف رُخ کرے گا۔ اس کا نتیجہ آخر الامر مایوسی ہوگا۔ ان ہر دو نظام ہائے تعلیم کو ایک دوسرے میں مدغم کرنا معاشرے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے انہوں نے جدید نصابی کمیٹی کی تشکیل فرمائی ہے جو اس تجویز کو عملی شکل دینے کے لئے نصاب تعلیم کی سفارشات کرے گی۔ یہ مبارک اقدام ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہماری گزارش یہ ہے کہ یہ مقصد نصابی کمیٹیوں کی تشکیل سے حاصل نہیں ہو سکے گا۔ یہ ایک عظیم انقلابی اقدام ہے جس کے لئے

ملک گیر جدید نظامِ تعلیم وضع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ۔

(i) ملک میں صرف اسکول اور کالج رہیں۔ مذہبی مکاتب اور دارالعلوم بند کر دیئے جائیں۔

(ii) نصابِ تعلیم میں الگ اسلامیات کا شعبہ نہیں رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس الگ شعبہ سے پھر وہی ثنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ (یہ "اسلامیات" کیا ہے اور اس کے نتائج کیا۔ اس کے متعلق ہم تفصیل سے کبھی پھر لکھیں گے)

(iii) نصابِ تعلیم ایسا ہو کہ طلبا کو جو مضمون بھی پڑھایا جائے، اس میں بتایا جائے کہ قرآن کریم اس باب میں کیا تعلیم دیتا ہے۔ اور اس کے ماحصل کو کس طرح اسلام کی پیش کردہ مستقل اقدار انسانیت کے تابع رکھا جا سکتا ہے اس کے ساتھ ہی انہیں روزمرہ کی زندگی میں ان امور سے روشناس کرا دیا جائے جن کی سرانجام دہی کے لئے آج کل ایک الگ مولوی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

(iv) اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں کی تعلیم لاء کالج میں دی جائے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، نظامِ تعلیم کی یہ تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں، یہ بہت بڑی تبدیلی ہوگی۔ اس لئے اس کے لئے بڑے عزم، ہمت، محنت اور تدبر کی ضرورت ہوگی۔ لیکن اگر یہاں یہ تبدیلی پیدا ہو گئی تو ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کو عالم اسلام ہی میں نہیں، اقوام عالم میں ممتاز ترین مقام حاصل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ

(۱) جس قوم میں مذہبی پیشوائیت موثر ہوگی وہ قوم کبھی مقامِ آدمیت تک نہیں پہنچ سکے گی۔ اور

(۲) جو قوم خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار سے بے بہرہ رہے گی۔ اسے انسانیت کی سطح نصیب نہیں ہو سکے گی۔

"دین اور دنیا" کی تعلیم کے ادغام سے مراد یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت کو ختم کر کے، قوم کے نوجوان طبقہ کو مستقل اقدارِ خداوندی سے روشناس کرایا جائے۔ اس سے یہ صحیح مقامِ انسانیت تک پہنچ سکیں گے۔ اس نصب العین کو سامنے رکھ کر اس کی طرف تدریجاً بڑھتے چلے جانا چاہئے۔ واللہ المستعان۔

یہ ہے مرحوم (صدر) ایوب کے نظریات، خیالات اور معتقدات کی ایک جھلک جسے ہم نے ان کے خطبات، بیانات اور تقاریر سے مقتبس کیا ہے۔ یہ قریب دس سال پر پھیلے ہوئے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ ان میں کس قدر ہم آہنگی اور یک رنگی ہے۔ اس دس سال کے عرصہ میں خارجی حالات میں بڑے بڑے تغیرات رونما ہوئے لیکن ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی یا بے ربطی پیدا نہیں ہوئی۔ اس سے واضح ہے کہ ان کے یہ خیالات نہ تو مصلحت کوشی کا میکانکی نتیجہ تھے اور نہ ہی وہ ہنگامی جذبات کا شورِ تلاطم۔ یہ ان کے غور و فکر کا نتیجہ تھے اور ان کی محنت و صداقت پر انہیں پختہ یقین تھا۔ ان کے دورِ سیاست کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ہم اس وقت اس پر کوئی محاکمہ نہیں کرنا چاہتے۔ سیاسی آندھیاں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں لیکن خیالات اگر مبنی بر صداقت ہوں تو وہ باقی رہتے ہیں۔ یہی ہمارے نزدیک مرحوم کی زندۂ جاوید یادگار رہیں۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مزدوروں کا مسئلہ

قریب قریب ساری دُنیا میں، ہر سال، یکم مئی کو ایک تقریب منائی جاتی ہے جسے "مزدوروں کا دن" کہا جاتا ہے۔ پس منظر اس کا یہ ہے کہ قریب اسّی نوّے سال پہلے، شکاگو (امریکہ) کے ایک کارخانے کے مزدوروں نے اپنی حقوق طلبی کے لئے مظاہرہ کیا۔ پولیس (یا شاید فوج) سے ان کا تصادم ہوا جس میں کچھ مزدور ہلاک ہو گئے۔ یہ یکم مئی کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد، ہر سال، دنیا کے مزدور، اس دن کو بطور یادگار مناتے ہیں۔

اگر اسّی نوے سال اُدھر سے نہیں، تو کم از کم چالیس پچاس سال اُدھر سے صورت یہ ہو رہی ہے کہ مزدور اپنے مطالبات پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تسلیم کر لئے جاتے ہیں۔ کچھ مسترد۔ اس سے ان کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے جس کا مظاہرہ اشتعال انگیز، تخریب آمیز، فساد خیز، مظاہروں میں ہوتا ہے۔ پچھلے مطالبات پورے ہوتے ہیں تو ان کی فہرست میں جدید مطالبات کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ہی مزدوروں کے اضطرابات بھی اسی نسبت سے شدید ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ پہلے اسے قوت کے زور سے دبانے کی کوشش کی گئی۔ وہ ناکام رہی۔ اب گفتگوئے مصالحت سے، آجر اور متاجر میں مفاہمت کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ وہ بھی اکثر و بیشتر ناکام رہتی ہیں۔ معاشرہ میں انتشار بڑھتا جاتا ہے۔ یہ کچھ ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ (اگر سو سال نہیں تو کم از کم چالیس پچاس سال سے یہ کشمکش جاری ہے اس کا اطمینان بخش حل کیوں نہیں ملتا! جواب اس کا صاف اور واضح ہے کہ جب تک مزدور کو مزدور سمجھا جائیگا اس کا حل نہیں مل سکے گا۔ مزدور سے مراد ہے (مزد + ور) یعنی اُجرت پانے والا۔ آجر (اُجرت دینے والے) نے تو اُسے (مزد + ور) سمجھنا ہی تھا۔ حیرت ہے کہ خود مزدور بھی اپنے آپ کو مزدور ہی سمجھتا ہے۔ اور قطعاً نہیں سوچتا کہ ایسا سمجھنے سے وہ اپنے آپ کو کس مقام پر لے آتا ہے۔ نظام سرمایہ داری کا مدار "اُجرت" کے نظریہ پر ہے۔ یعنی اس نظام میں ایک فریق آجر (اُجرت دینے والا) ہوتا ہے۔ اسے سرمایہ کار کہا جاتا ہے۔ اور دوسرا فریق، متاجر (اجرت پانے والا)۔ اسے مزدور کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں مزدور کو اس کی محنت کا "معاوضہ" دیا جاتا ہے۔ کام کرنے والے کی محنت کا معاوضہ کتنا ہونا چاہیئے۔ اس کا تعین سرمایہ دار کرتا ہے۔ اس کے لئے کوئی معیار مقرر نہیں۔ یعنی اس کا

کوئی معیار مقرر نہیں کہ مزدور کو (مثلاً) پانچ روپے روز کیوں دیئے جائیں - دس روپے کیوں نہیں؟ اس کا سارا دارومدار طلب (DEMAND) اور رسد (SUPPLY) پر ہے - یعنی اگر بیکار مزدوروں کی تعداد زیادہ ہے تو وہ پانچ روپے روز پر بھی کام کرنے کو تیار ہو جائینگے - اگر کم ہے تو وہ زیادہ اُجرت مانگیں گے - چونکہ "کم یا زیادہ" ماپنے کا کوئی پیمانہ مقرر نہیں، اس لئے مزدور کی کوشش، یا کم از کم خواہش، ہوگی کہ اسے زیادہ سے زیادہ اُجرت ملے اور آجر کی کوشش کہ اسے کم از کم دیا جائے - مزدور کو کچھ بھی دیا جائے - وہ محسوس کرتا ہے کہ اُسے کم ملا ہے - اس کے مقابلہ میں آجر سمجھتا ہے کہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے - یہ ہے اس تصادم کی بنیادی وجہ - اگر کوئی معیار مقرر ہو تو اس سے کم دینا، ظلم یا ناانصافی کہلائے گا - اور اس سے زیادہ مانگنا ناجائز مطالبہ - لیکن جب کوئی معیار ہی مقرر نہ ہو تو کوئی کہہ ہی نہیں سکے گا کہ انصاف ہو رہا ہے یا نہیں - (مثلاً) کپڑا ماپنے کا پیمانہ گز ہے - اگر گاہک ایک گز کی قیمت ادا کرے اور دُکاندار اُسے پندرہ گرہ کپڑا دے تو کہا جائے گا کہ اس نے کپڑا کم دیا ہے - اور اگر گاہک سترہ گرہ کپڑا مانگے تو اُس کا مطالبہ ناجائز قرار دیا جائے گا - کیونکہ وہ زیادہ طلب کر رہا ہے - لیکن اگر گز ہی نہ ہو تو کم اور زیادہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا - معیار یا پیمانے کے بغیر اُجرت، گز کے بغیر کپڑے کی خرید و فروخت ہے - جس میں جھگڑے کا امکان مستقلاً رہتا ہے - انصاف کسی خارجی معیار سے ماپا جاتا ہے -

یہ صورت تھی نظامِ سرمایہ داری میں - اس نت نئے دن کے جھگڑے اور تصادم سے تنگ آکر، ہمارے دور میں ایک نئے نظامِ معیشت کی طرح ڈالی گئی جسے اشتراکیت یا سوشلزم کہا جاتا ہے - لیکن یہ مسئلہ اس سے بھی حل نہ ہوا - اشتراکی ممالک میں بھی مزدور، (مزد + ور) ہی ہے - اسے بھی اُجرت ہی ملتی ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے (نظامِ سرمایہ داری میں) آجر (اُجرت دینے یا مقرر کرنے والا) کوئی فرد یا افراد کی تنظیم (پرائیویٹ فرم یا کمپنی وغیرہ) ہوتی تھی - اس نظام میں، اُجرت، حکومت مقرر کرتی ہے کیونکہ وہ کارخانوں کو اپنی تحویل میں لے لیتی ہے - لیکن آجر کا نام بدل جانے سے تو مزدور کا اطمینان نہیں ہو سکتا - وہ بنیادی خرابی (یعنی اجرت کے تعین کا سوال) جو اس کے لئے باعثِ اضطراب ہے، اپنی جگہ بدستور قائم رہتی ہے - یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر، اقبال نے کہا تھا کہ:

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا!
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

یعنی اقتدار اگر سرمایہ داروں کے بجائے اشتراکین کے ہاتھ میں آجائے تو بھی مزدور کی حالت ویسی ہی رہے گی - آجر اور مستاجر کی کشمکش ختم نہیں ہوگی - یہ کشمکش اسی صورت میں ختم ہو سکتی ہے کہ اُجرت کا تصور ختم کر دیا جائے -

اور یہ صرف قرآن کے معاشی نظام میں ہو سکتا ہے - اس نظام میں نہ آجر و مستاجر کا

امتیاز باقی رہتا ہے، نہ اُجرت کا سوال۔ اِس میں ہر فرد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا مہیّا کرنا۔ نظام حکومت کے ذمہ ہوتا ہے۔ اس میں کام کرنے والوں کو، ان کے کام کی اُجرت نہیں ملتی۔ ان کی ذمہ داری کام کرنا ہوتا ہے اور اربابِ نظم و نسق کی ذمہ داری ان کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا۔ یہ وہ قرآنی اصول تھا جس کے پیشِ نظر، نبی اکرمؐ، مالِ غنیمت، میں سے غیر شادی شدہ سپاہی کو ایک حصہ دیتے تھے۔ اور اہل و عیال والے کو دو حصے ـــــ یعنی اس کی اور اس کے اہل و عیال کی ضروریات کے مطابق حصہ۔ (یہ اس نظام کی ابتدائی صورت تھی) یہ وہ دنیا کا عظیم محسن تھا (علیہ الصلوٰۃ والسلام) جس نے "اُجرت" کی جگہ "ضرورت" کا اصول دے کر، مزدور کے تصوّر کو ختم کر دیا۔ اور اس کے ختم ہو جانے سے وہ تصادم خود بخود رفع ہو گیا جس نے سارے کرہ ارض کو فساد گاہ بنا رکھا ہے۔ پھر اس نظام میں، محنت کشوں (کام کرنے والوں) (WORKERS) کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ اس میں ہر فرد معاشرہ (بجز ان کے جو کسی طرح کام کرنے سے معذور ہوں) کام کرتا ہے۔ اس لئے اس میں سب محنت کش یا کاسب ہوتے ہیں۔ سوچئے کہ جب ہم معاشرہ کے محنت کشوں یا ورکرز کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ معاشرہ میں ایسے لوگ بھی ہیں جو (بلا عذر) محنت یا کام نہیں کرتے۔ قرآن کے معاشی نظام میں یہ تفریق بھی باقی نہیں رہتی۔ اس میں سب محنت کش یا ورکرز ہوتے ہیں تقسیم عمل کے اصول کی رو سے، کام کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ لیکن اس میں محنت کشوں یا کام کرنے والوں کا الگ طبقہ نہیں ہوتا۔ معاشرہ میں اس قسم کی طبقاتی تقسیم و تفریق بھی اُجرت کے تصور کی پیدا کردہ ہے۔ جب اسے ختم کر دیا جائے تو طبقاتی تفریق بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اس قسم کے غیر طبقاتی معاشرہ کے ضمن میں ایک سوال یہ پیدا ہو گا کہ جس شخص کی ضروریاتِ زندگی، کم ہیں (مثلاً وہ مجرد ہے یا اس کا ایک آدھ بچہ ہے) اور دوسرے کی ضروریات نسبتاً زیادہ تو کم ضروریات والا، زیادہ ضروریات والے کے برابر محنت کیوں کرے گا؟ یعنی جب اسے ملنا تھوڑا ہے تو وہ جان مار کر محنت کیوں کرے گا۔ اس کا جواب دنیا کا کوئی قانون نہیں دے سکتا۔ اس کا تعلق دل کی آمادگی سے ہے، اور قانون یا دیگر خارجی محرکات، کسی کو کام کرنے پر مجبور تو کر سکتے ہیں، آمادہ نہیں کر سکتے۔ دنیا نے اس کا علاج "بھوک" سوچا۔ یعنی کام کرنے والے کو بھوکا مارا جائے تاکہ وہ کام کرنے پر مجبور ہو جائے۔ لیکن جس نظام میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں اور کوئی بھوکا نہ رہے۔ اس میں وہ کون سی قوت ہو گی جو محنت کش کو اس پر مجبور کر دے کہ وہ جان مار کر محنت کرے۔ سوشلزم کے پاس اس کا کوئی حل نہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ نظام سرمایہ داری کی اس قدر سنگین اور شدید تنقید کے باوجود، اسی نظام کے اصول اُجرت کو اپنانے پر مجبور ہے۔ جیسا کہ اُوپر کہا گیا ہے۔ اس کا تعلق دل کی آمادگی سے ہے، اور دل کی آمادگی داخلی تبدیلی سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ خارجی قوانین و محرکات سے۔ یہی وہ مقام ہے، جہاں اشتراکیت اور قرآنی نظام کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اشتراکی نظام کی بنیاد اُسی نظریہ حیات پر ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ زندگی

بس یہی طبعی زندگی ہے ـــــ یعنی حیوانی زندگی ـــــ جس طرح حیوانات میں داخلی یا قلبی تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا ـــــ ان سے بزورِ قوت یا بھوکا رکھ کر کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح زندگی کو فقط طبعی زندگی ماننے والوں میں بھی قلبی تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، قرآن کا نظریہ حیات یہ ہے کہ زندگی صرف طبعی زندگی نہیں، جس کا موت کے ساتھ خاتمہ ہو جاتا ہے۔ زندگی، مرنے کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ اور اُس کا مقام اُن کاموں کے نتیجہ کی رو سے متعین اور مرتب ہوتا ہے جو انسان اس دنیا میں کرتا ہے اُسے حیاتِ آخرت یا قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ (یا ایمان) کی رو سے، جو شخص یہاں جس قدر زیادہ، اور قرآن کے متعین کردہ اصولوں کے مطابق کام کرتا ہے، اس کی اگلی زندگی اتنی ہی زیادہ سنورتی اور نکھرتی ہے۔ قرآنی نظام جب افرادِ معاشرہ کو رزق (زندگی کی طبعی ضروریات) کی طرف سے مطمئن کر دیتا ہے تو وہ اپنی ساری توجہ اور توانائی اُس کام کے سرانجام دینے میں صرف کر دیتے ہیں جو ان کی تفویض میں دیا گیا ہو۔ اس کے لئے نہ ان پر کسی نگران یا داروغہ مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ کسی خارجی محرکہ کی حاجت۔ آپ اسے ایک دو مثالوں سے سمجھئے۔ مئی۔ جون کا مہینہ ہے۔ درجہ حرارت ۱۱۶ - ۱۱۷ تک پہنچ رہا ہے۔ سولہ سولہ گھنٹے کا دن ہے۔ ایک روزہ دار۔ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا ہے (یا کھیت میں کام کر رہا ہے) پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔ پاس ہی ٹھنڈے پانی کی صراحی رکھی ہے۔ اس وقت اسے کوئی دیکھنے والا بھی نہیں۔ وہ شدتِ پیاس سے تڑپتا رہے گا۔ لیکن پانی کا ایک قطرہ اپنے حلق میں نہیں ٹپکائے گا۔ سوچئے کہ دنیا کا کوئی قانون اسے ایسا کرنے سے باز رکھ سکتا ہے؟ یا ایک شخص سال بھر سخت محنت کر کے کچھ رقم بچاتا ہے۔ اس کا کسی کو علم نہیں۔ لیکن وہ سال گزر جانے کے بعد، خود ہی حساب کر کے، اس میں سے زکوٰۃ کا روپیہ نکال کر، کسی کو بتائے بغیر، کسی حاجت مند کو دے دیتا ہے۔

فرمائیے، دنیا کا کوئی قانون اسے ایسا کرنے پر "آمادہ" کر سکتا ہے! یہ کچھ اس داخلی محرکہ سے ہوتا ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ (ہم اس وقت ان لوگوں کا ذکر نہیں کرتے جو محض رسماً یا تقلیداً ایسا کرتے ہیں۔ ہم ان کا ذکر کر رہے ہیں جو دل اور دماغ کی کامل آہنگی کے بعد، سمجھ سوچ کر ایسا کرتے ہیں) یہی ہے وہ ایمان جو انسانوں کو اس پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کریں اور کم از کم اپنے لئے رکھ کر، باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں۔ یہ ہے وہ نظام جس میں مزدور "مزدہ (اجرت) کے لئے کام نہیں کرتا۔ وہ اپنے ایمان کے تقاضا سے ایسا کرتا ہے۔ اقبال نے جب روس سے کہا تھا کہ تم نے اتنے بڑے عالمگیر انقلاب کی عمارت کا نقشہ تو مرتب کر لیا، لیکن یہ بھی سوچا کہ وہ کونسی بنیاد ہے جو اس عمارت کا بوجھ سنبھال لے گی؟ تمہارا فلسفۂ حیات اس قسم کی بنیاد مہیا نہیں کر سکتا۔ یہ بنیاد تمہیں "ام الکتاب" (قرآن عظیم) سے ملے گی۔

لہٰذا، مزدوروں کے مسئلہ کا حل نہ امریکہ کے پاس ہے نہ روس کے۔ نہ یورپ کے پاس ہے نہ چین کے۔ اس کا علاج نہ مزدوروں اور محنت کشوں کی ہڑتالوں میں ہے نہ ان کے ساتھ مفاہمت میں۔

اس سارے فساد کی جڑ "مزد" (اُجرت) کا غلط کا نظریہ ہے، اور جب تک یہ نظریہ باقی ہے، یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اس کا حل صرف قرآن کے معاشی نظام میں مل سکتا ہے جس کی بنیاد حیاتِ آخرت کے ایمان پر ہے۔ اس نظام میں ہر فرد معاشرہ محنت کش یا کام کرنے والا (ورکر) ہوتا ہے اور ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا "صلہ" ملتا ہے۔ لیکن یہ صلہ اُجرت کی شکل میں نہیں ہوتا۔ یہ صلہ ملتا ہے یہاں کی طبعی زندگی کے لئے سامانِ پرورش اور آخرت کی زندگی کے مدارج کے تعین کی شکل میں۔ قرآن کریم میں شروع سے آخر تک، دیکھ جایئے، اس میں صلہ یا بدلہ عمل کا ملتا ہے۔ "مذہب" کی دنیا میں (عمل کی جمع) اعمال سے مراد چند مخصوص رسمیں ہوجاتی ہیں لیکن عمل کے سیدھے سادے معنی کام ہیں۔ اور جب کوئی کام، دین کے پروگرام کے مطابق کیا جائے تو وہ عمل صالح بن جاتا ہے۔ ان اعمال (کاموں) کا بدلہ اس دنیا میں، رزقِ کریم (باعزت روٹی) کی شکل میں ملتا ہے، اور آخرت میں خوشگوار زندگی کی صورت میں۔ لہٰذا اسلامی معاشرہ میں ہر فرد، کام کرنے والا (ورکر) ہوتا ہے۔ وہ کام کرتا ہے اور معاشرہ اس کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچاتا ہے۔ جہاں تک طبعی زندگی کی ضروریات کا تعلق ہے، یہ قریب قریب ہر انسان کی یکساں ہوتی ہیں۔ وہ کونسا قانونِ فطرت ہے جس کی رُو سے کہا جائے گا کہ مل کے مالک کے بچے کے لئے ناشتہ میں دودھ، انڈے، مکھن، توشس، پھل ضروری ہیں اور مزدور کے بچے کے لئے سُوکھی باسی روٹی کا ٹکڑا کافی۔ خدا نے تو ان دونوں بچوں کا نظامِ پرورش ایک جیسا بنایا ہے۔ یہ تفریقِ رزق کی غلط تقسیم کی پیدا کردہ ہے، جس کا جواز اجرت کے نظریہ کی شکل میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

کارل مارکس کو بھی اس کا احساس ہوگیا تھا کہ صحیح معاشی نظام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اجرت کا تصور ہے اس لئے اس نے کہا تھا کہ صحیح نظام ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام اور ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق معاوضہ کے اصول پر قائم ہوسکے گا لیکن جب اس سے کہا گیا کہ آپ اس نظام کو عملاً نافذ کرنے کا طریق کیوں نہیں بتاتے یا رائج نہیں کرتے، تو اس نے کہا کہ مجھے وہ بنیاد نہیں ملتی جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوسکے۔ اس لئے میں سردست اسے معرضِ التوا میں رکھتا ہوں۔ شاید "زمانے کے تقاضے" اُن کو اُس مقام تک لے آئیں۔

یہاں پر ایک اور اہم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کارل مارکس نے بات تو سمجھ لی تھی لیکن اسے اس کی اساس نہیں ملتی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام "بات سمجھ لینے" سے قائم نہیں ہوسکے گا۔ جس نظام کو محض قانون کے زور پر قائم ہونا ہو، اس کے لئے "سمجھ لینا" کافی ہوتا ہے لیکن جس نظام کا سرچشمہ دل کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہو، اسے سمجھ لینے کے بعد ایمان کی حیثیت سے قبول کرنا اولین شرط ہوگا۔ یہ وجہ ہے کہ جو قرآن کا نظام اس جماعت (کے ہاتھوں ہی نہیں بلکہ اس جماعت) کے اندر قائم ہوتا ہے، جس کے افراد حیاتِ آخرت کو ایمان کا درجہ دے چکے ہوں ـــــ "ایمان" کے معنی یہ ہیں کہ ان کا کوئی عمل، اقدارِ خداوندی کے خلاف نہ ہو۔ اس قسم کے افراد کو قرآن کریم نے مومنین، اور ان پر مشتمل جماعت کو اُمتِ مسلمہ کہہ کر پکارا ہے۔

لہٰذا، سوال اتنا ہی نہیں کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے! یہ طے ہو جانے اور سمجھ میں آجانے کے بعد بھی اصلی سوال یہ ہوگا کہ کیا وہ لوگ بھی موجود ہیں جن کے ہاتھوں اور جن کے اندر یہ نظام عملاً متشکل ہوگا۔ یعنی وہ لوگ جن کا خدا کے قانونِ مکافات (حیاتِ آخرت) پر یقین محکم ہو!

یہ غولِ بیابانی!

اس صدی کے اوائل تک، یہ مشہور تھا کہ سلطنتِ برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا۔ یہ سلطنت اپنی وسعت ہی میں ایسی حدود فراموش نہ تھی۔ اس کی شوکت و ثروت، اور دولت و حشمت بھی ضرب المثل تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی تہذیب و تمدن کی چمک دمک اقوامِ عالم کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دیتی تھی۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی اور قریب چھ سال تک جاری رہی۔ انگلستان مسلسل اس کی زد میں رہا۔ جنگ میں بچے اور بوڑھے تو نسبتاً محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن نوجوان نسل بُری طرح تباہ ہو جاتی ہے۔ جنگ کے بعد جائزہ لیا گیا تو وہاں کی آبادی کے بچوں اور بوڑھوں کے درمیان ایک خلا پیدا ہو چکا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اپنی نو آبادیات (COLONIES) کے نظم و نسق کے لئے جس قسم کے توانا افراد کی ضرورت تھی ان میں بڑی کمی واقعہ ہو گئی۔ اس کی وجہ سے اُن دور دراز کے علاقوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی سبایں ہمہ، اس نے کوشش کی کہ ان آبادیوں کی انتظامی مشینری رواں دواں رہے۔ پندرہ بیس سال میں اس نے خدا خدا کر کے یہ کمی پوری کی کہ دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور پھر چھ سال ایسے گزرے جن میں ہر رات لندن پر بمباری ہوتی تھی۔ ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو افرادی قوت کے لحاظ سے انگلستان کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اب اس کے لئے اپنی نو آبادیات کے سنبھالنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ قوم سمجھدار اور منجھی ہوئی تھی اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اپنی عزت سنبھال کر ان آبادیوں سے چلی آئے۔ یہ جو ۱۹۴۵ء کے بعد انگلستان کی متعدد کالونیز کو آزادی حاصل ہوئی تھی (جن میں سرِفہرست ہندوستان تھا) اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ اس قوم میں نئی نسل کا یہ خلا (GAP) اس قدر وسیع و مہیب تھا کہ اس کے بعد اس قوم کے کہیں پاؤں ہی نہیں ٹک سکے اور جس قوم کو ابھی کل تک اقوامِ عالم کی قیادت نصیب تھی، اس نے جو گرنا شروع کیا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے پہلی سے دوسری، دوسری سے تیسری، تیسری سے چوتھی اور چوتھی سے پانچویں طاقت بنتی گئی۔ حتیٰ کہ اب اقوامِ عالم کی صف میں اس کا کوئی شمار قطار ہی نہیں۔

یہ ہوتا ہے کسی قوم کی نئی نسل کے معدوم ہو جانے کا فطری نتیجہ۔

لیکن یہ خلا صرف اس طرح پیدا نہیں ہوتا کہ جنگ یا کسی اور خارجی حادثہ سے کسی قوم کی جوان نسل صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ اس سے کہیں زیادہ مہیب اور تاریک خلا اس طرح بھی پیدا ہوتا ہے کہ قوم کی نئی نسل علم و اخلاق سے محروم اور سیرت و کردار سے مہجور ہو جائے یعنی اس کی نئی نسل، طبعی طور پر

تو زندہ ہے لیکن انسانیت کی سطح پر مر چکی ہو۔ اگر کسی قوم کی نئی نسل طبعی طور پر ختم ہو جائے تو اس سے بھی اس قوم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے لیکن اگر صورت یہ ہو کہ یہ نسل طبعی طور پر تو زندہ ہو لیکن محض حیوانی سطح پر تو اس کی زندگی، اس کی موت سے کہیں زیادہ نقصان رساں اور تباہ کن ہوتی ہے۔ یہ ایک بے سری فوج ہوتی ہے جس کے سامنے تخریب کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ انسانوں کی جماعت نہیں بلکہ ایک (FRANKENSTEIN) ہوتا ہے جس میں قوت دیو کی اور کھوپڑی پاگل کی ہوتی ہے۔ یہ غولِ بیابانی، قریہ قریہ، بستی بستی، شہر شہر پھرتا ہے اور جو کچھ سامنے آئے اُسے توڑتا، پھوڑتا، مسلتا، روندتا چلا جاتا ہے۔ اگر کسی بستی میں ایک تشدد پسند پاگل آزاد پھر رہا ہو تو وہ ساری بستی کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی قوم کی پوری کی پوری جوان نسل پاگل ہو جائے تو سوچئے کہ اس قوم کا حشر کیا ہو گا!

پاکستان میں باصلاحیت افراد کی پہلے ہی کمی تھی۔ تقسیم کے وقت جو معدودے چند دیدہ ور یہاں موجود تھے یا ادھر آئے۔ وہ رفتہ رفتہ ختم ہوتے چلے گئے۔ اس خلا کو ہماری نئی نسل نے پُر کرنا تھا۔ لیکن اس نسل کی تعلیم و تربیت سے جو ہم نے مجرمانہ تغافل برتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم اس نئی نسل کے ہاتھوں لرزاں و ترساں ہے۔ کہنے کو تو ملک میں جس قدر اسکول اور کالج اب ہیں۔ تشکیلِ پاکستان کے وقت ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن ان درسگاہوں سے جو لاوا پھوٹتا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ

اس سیل۔۔۔ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک!!

اس وقت تو ہم اس سیل بے پناہ کی تباہ کاریوں کے ہاتھوں ہی نالاں ہیں۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جب کل کو ملک کا اقتدار بھی ان کے ہاتھ میں آیا ــــ اور یہ اقتدار زود یا بدیر، بہرحال انہی کے ہاتھ میں آئے گا ــــ تو اس مملکت کا حشر کیا ہو گا؟ اربابِ حکومت ہمیں اطمینان دلاتے ہیں کہ یہ خطۂ زمین بہرحال محفوظ رہے گا۔ وہ یہ کہتے ہیں اور ہماری زبان سے بے ساختہ نکلتا ہے ــــ تری آواز مکے اور مدینے۔ لیکن ہم ان سے پوچھنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اس خطہ کو محفوظ کر کے، اسے آپ جن کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ ان کی بھی خبر ہے؟ ہم آپ کی یقین دہانی پر بھروسہ کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ آپ اس ملک کو غیروں کے ہاتھوں سے محفوظ کرا دینگے۔ لیکن اس کے لئے بھی تو ہمارے اطمینان کی کوئی صورت پیدا کیجئے کہ اس محفوظ خطہ زمین کو آپ جن کے حوالے کریں گے۔ یہ ان کے ہاتھوں بھی محفوظ رہے گا۔ ہمیں تو اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی جس نسل میں نہ تعلیم ہو نہ تربیت، اور اس کے برعکس وہ ہر قسم کی وحشت سامانی پر فخر کرے۔ اس کے ہاتھوں مملکت محفوظ کیسے رہ سکتی ہے! اربابِ اقتدار سے ہمارا سوال یہ ہے کہ آپ نے اس خطرہ سے محفوظ رہنے کا کیا انتظام کیا ہے؟ ملک میں جو کچھ تعلیمی اصلاح کے

نام سے ہوا ہے، وہ اس سے زیادہ کیا ہے کہ پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں کا انتظام حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اول تو یہ امر بھی بحث طلب ہے کہ اس سے انتظامات میں بھی کوئی اصلاح ہوئی ہے یا نہیں۔ لیکن اس حقیقت سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ طالب علم "مادر پدر آزاد" ضرور ہو گئے ہیں۔ ہم نے پاکستان مانگا تھا کہ یہاں مردانِ مومن پیدا ہو سکیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ 'مردانِ مومن تو کجا' ہم انسانی سطح سے بھی نیچے گر کر خالص حیوانی سطح پر آ گئے۔ یقین مانئے، ہم اپنے دورِ غلامی میں اس قدر پست سطح پر نہیں تھے جس پر ہم اب پہنچ چکے اور مزید پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ اُس وقت ہم میں کم از کم انسان تو پیدا ہوتے تھے۔

اگر قوم میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہے جس کے دل میں پاکستان کا درد اور جس کے دماغ میں سوچنے کی صلاحیت ہے۔ تو ہم ان کی خدمت میں پوری قوت اور شدت سے گزارش کریں گے کہ وہ (سیاسیات سے قطع نظر) خالصتہً تعلیمی مقصد کے لئے سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ یہ جو ہم، جاہلوں ہی کی نہیں وحشیوں کی کھیپ پر کھیپ تیار کئے چلے جا رہے ہیں، اس کا انجام کیا ہو گا؟ یہ سوچیں اور پھر دیکھیں کہ (اگر موجودہ نسل کا مرض لاعلاج حد تک پہنچ چکا ہے تو کم از کم) آنے والی نسلوں کو انسان بنانے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی قوم کا سوچنے والا طبقہ، اجتماعی مسائلِ حیات سے غیر متعلق (INDIFFERENT) ہو کر بیٹھ جائے۔ تو پھر اس قوم کی تباہی میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ اگر آپ اس مسئلہ کے متعلق اجتماعی سطح پر نہیں سوچنا چاہتے تو کم از کم انفرادی سطح پر ہی سوچئے۔ آپ سوچئے کہ ہماری موجودہ نسل جس نہج پر اٹھ رہی ہے، اس کے ہاتھوں یہاں آپ کا (اور کسی کا) کچھ بھی محفوظ رہ سکے گا؟

آخر میں ہم اسے پھر دُہرا دیں کہ اگر ہماری نئی نسل کی تعلیمی حالت یہی رہی تو یہ مُلک کسی صورت میں بچ نہیں سکے گا۔ اگر اس کی سرحدیں محفوظ بھی رہیں تو اس کو چلانے والے کوئی نہیں ہونگے۔ سب تباہ کرنے والے ہونگے۔ یاد رکھئے۔ یہ نئی نسل قوم کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ اس سرمایہ کو اس طرح ضائع نہ ہونے دیں۔ ان کی بے راہ روی پر ہمارے دلوں میں ان کے خلاف نفرت یا انتقام کے جذبات نہیں اُبھرنے چاہئیں۔ اس لئے کہ ان کی اس بے راہ روی کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ جنہوں نے ان کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام نہیں کیا۔ ان کی تعلیم کا ایسا انتظام کیجئے کہ قرآنی اقدار ان کے قلب و دماغ میں رچ بس جائیں۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ نہ خود ہی انتشار پیدا کریں گے اور نہ ہی مفاد پرست گروہ انہیں اپنا آلۂ کار بنا سکیں گے۔

شاہکارِ رسالتؐ

(ایک معرکہ آرا تصنیف)

عجمی تخیلات ——— علامہ اقبالؒ اور غلام احمد پرویزؔ

(آغا شورش کاشمیری)

علامہ اقبالؒ نے تشکیل جدید الٰہیات کے پانچویں خطبہ میں فرمایا تھا،

"اگر قوم کے زوال و انحطاط کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ ہم گذشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں یا اس کا احیا خود ساختہ ذرائع سے کریں۔"

چودھری محمد احسن کے نام حضرت علامہ نے ایک خط میں لکھا (ملاحظہ ہو اقبال نامہ) کہ

"میرے نزدیک مہدیت و مسیحیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی و عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ ان کا عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے کوئی سروکار نہیں۔"

ایک دوسرے خط میں جو مولوی سراج دین کے نام ہے علامہ فرماتے ہیں:

"ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں ان کو عربی اسلام اس کے نصب العین اور اس کی غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔"

انوارِ اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار (صفحہ ۱۹۲، ۱۹۳)

ڈاکٹر سید یامین ہاشمی کے نام علامہ کا ایک خط ہے، فرماتے ہیں:

"میری رائے میں عجمیت ایشیا کے مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ اس باطل کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ عجمیت کا اثر مذہب، لٹریچر اور عام زندگی پر غالب ہے۔"

محمد دین فوق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"عربی اسلام ہندوستان میں ایک فراموش شدہ چیز ہے۔"

(انوار اقبالؒ صفحہ ۶۶)

ارمغانِ حجاز کا وہ مصرع۔ ؎

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ

اقبال کے اس شدید تاریخی احساس ہی کا نتیجہ تھا۔

محولا بالا اشارات (اقتباسات) کا اقتضاء تھا کہ دانشورانِ اقبال اس موضوع پر قلم اُٹھاتے اور اسلامیات کی تاریخ میں عجمی اثرات کا جائزہ لیتے لیکن کسی اقبالی نے اس پر غور نہیں کیا، نہ اس طرف توجہ کی اور نہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے راستہ کی اس سب سے بڑی روک کو دُور کیا ——— اغلب خیال ہے کہ وہ اس کے اہل ہی نہ تھے اور ایک دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ ان کی روپہلی اور طلائی مصلحتوں میں اس کا حوصلہ ہی نہ تھا۔

دو روز پہلے مولانا تاج محمود (لائل پور) کی معیت میں ایک فاضل دوست سے ملاقات ہوئی تو وہاں دورانِ گفتگو اسلامیات میں عجمی اثرات کا ذکر آ گیا۔ اس دوست نے جناب غلام احمد پرویز کی تازہ کتاب **شاہکارِ رسالت** (عمر فاروقؓ) کا ذکر کیا کہ اس کا مطالعہ ہر علم دوست کا فرض ہے۔ اقبال نے جس عجمی سازش کا خطوط و خطبات میں اشارۃً بیان کیا شاہکارِ رسالت اس کا تفصیلی مرقع ہے۔ بڑے سائز کے ۵۲۸ صفحات کی۔ اس کتاب میں پندرھواں باب بہ عنوان (شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد) کے تقریباً سو صفحات عجمی سازش کی تفصیلات سے متعلق کئی ہزار تاریخی صفحات کا نچوڑ ہیں۔ اس جامع باب کو ایک جامع کتاب کی خصوصیت حاصل ہے۔ ہر ضمنی عنوان کے تحت اس کی تفصیل موجود ہے۔ کوئی سی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ اگر کوئی سوال ذہن میں اُبھرتا ہے تو اس کا جواب انہی مباحث میں نکل آتا ہے۔ حتیٰ کہ عطائی طبیعت بھی کوئی نہ کوئی نیا نکتہ حاصل کر پاتی ہے۔

جہاں تک پوری کتاب کا تعلق ہے، راقم نے ابھی تک اس کا مطالعہ نہیں کیا۔ صرف چودھواں باب ہی بالاستیعاب پڑھا ہے۔ ظاہر ہے کامل مطالعہ کے بعد ہی پوری کتاب پر نقد و نظر کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ لیکن چودھویں باب کے مطالعہ سے فارغ ہو کر راقم نے محسوس کیا کہ:

(۱) پرویز نے عجم سے متعلق اقبال کی ذہنی تگ و دو کو اپنے قلم کی معرفت حقائق و معارف کے تاریخی سانچہ میں ڈھالا اور اندھیروں کو اُجالوں سے متعارف کیا ہے۔

(۲) کتاب کے متعلق جیسا کہ عرض کیا قبل از مطالعہ رائے دینا مشکل ہے۔ انشاء اللہ یہ فرض بھی جلد ادا ہو گا۔ لیکن چودھواں باب تاریخ اسلام کے سیاسی و علمی مصائب کی ایک تجزیاتی کہانی اور فی الجملہ عجم کے ہاتھوں اسلام پر کیا گزری کی روداد ہے۔

(۳) ہو سکتا ہے کسی دائرے میں یا کسی پہلو سے بعض اکابر علماء اور محقق فضلاء کو اساسی یا جزوی

اختلاف ہو لیکن راقم نے پرویز سے متعلق اپنے متعارف نظریے میں، جو علمائے کرام کے فتوے کی بدولت ذہن پر نقش تھا، ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کی۔ فی الجملہ پرویز اپنی سیاسی شدتوں اور شخصی عصبیتوں کے باوجود اسلام کے تاریخی ذہن سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر سوچتے ہیں۔ ان کے دل میں سرگزشت اسلام کی ویرانیوں پر شدید ہلچل ہے۔ اور وہ مسلمانوں کی نئی پود کے ذہنی اضطراب کو دور کرنے کے لئے عصری افکار کے لہجہ میں اسلام کی اساس پر اُن سے ہمکلام ہوتے ہیں۔

(۴) محولا باب کے مباحث ذیل کے عنوانوں پر ہیں۔ مثلاً

مسلمانوں کی طاقت کا راز کیا تھا؟ مسلمانوں سے قرآن چھڑا دینے کی باطنی تحریک کا آغاز اور اُس کے نتائج۔ ایران و روما کی فتوحات اور ان کا فرق۔ یزدگرد کے دستہ خاص کا قبول اسلام۔ فتح قادسیہ کے بعد ایرانی ردعمل، کوفہ و بصرہ میں ایرانیوں کی آبادکاری۔ عجمی سازش کے دو نمایاں محاذ۔ روایات کا علم خانہ۔ مسئلہ خلافت، حق وراثت کے سیاسی مضمرات، اہل ایران کا اپنے شہنشاہوں سے متعلق عقیدہ، عبداللہ بن سبا۔ رجعت کا عقیدہ۔ امامت کا منصوص تصور۔ کفر و ایمان کا خط امتیاز۔ مستند شیعی روایات۔ حضرت سلمان فارسیؓ۔ بنی اُمیہ اور بنو عباس کی رقابتیں۔ سادات علوی۔ ابومسلم خراسانی۔ برامکہ۔ فاطمین مصر۔ دیلمی حکومت۔ بغداد کا شیعی دور۔ عباسی سلطنت کا خاتمہ۔ ایرانیوں نے کتنی مدت بعد جنگ قادسیہ کا انتقام لیا۔ اسلام کی اساسات مختلف فرقے۔ اور ان کے ساختہ پرداختہ نظریے۔ محرف قرآن۔ باطنی معانی۔ محدث کا عقیدہ۔ کاشانۂ نبوت پر ذہنی آشیانہ۔ جامعین حدیث، سُنیوں کے عقائد پر عجمی اثرات۔ جمع قرآن سے متعلق شکوک و شبہات۔ ناسخ و منسوخ کا عقیدہ۔ حدیث کا مقام۔ ابن جریر طبری کون تھے؟ طبری کی تاریخ۔ اسلام دین نہ رہا مذہب ہو گیا۔ آیہ استخلاف کا مفہوم بدل گیا۔ مذہب و سیاست میں ثنویت۔ قانون سازی کے امکان کا خاتمہ۔ نظام سرمایہ داری کا احیاء۔ تقدیر کا عقیدہ۔ تقدیر سے متعلق روایات۔ تصوف کی حقیقت۔ ابن عربی۔ اساسات تصوف۔ باطنی علم کی سند۔ جہاد کے خلاف عجمی یلغار (افکار اقبال کی روشنی میں) مرزا غلام احمد کا دعوئے ایرانی سازش کا ملخص اور اُن عوارض و امراض کا علاج جو مسلمانوں کے وجود کو اجتماعی طور پر لاحق ہو چکے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی کئی ایک عنوان ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انسان ان کے مطالعہ سے علم و تاریخ کی صداقتوں سے متمتع ہوتا ہے۔

(۵) پرویز صاحب سے متعلق دینی حلقوں میں تسلسل و تواتر سے یہ فضا قائم رہی ہے کہ وہ منکر حدیث ہیں۔ لیکن انہوں نے جن شگفتہ الفاظ میں اپنے عقیدہ کی صراحت کی ہے اُس کے بعد معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔

راقم استفساراً علماء سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے

چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور کانٹ چھانٹ کے بعد صرف ۲۷۶۲ باقی رکھیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے تین لاکھ مدون کیں اور باقی ۴۸۴۳ رہنے دیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے تین لاکھ اکٹھا کیں۔ اور ۲۱۱۵ کو مرتب کیا۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ لاکھ فراہم کیں اور ۴۸۰۰ کو احاطہ تحریر میں لائے۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے چار لاکھ کا ذخیرہ کیا اور کتاب میں چار ہزار نقل کیں۔ امام نسائیؒ نے دو لاکھ کے خزانہ میں ۲۱۳۴ کو اپنے مجموعہ میں درج کیا۔ لیکن پرویز کی چھاڑ اس الزام میں کرنا کہ وہ احادیث کو تسلیم نہیں کرتے اس کی بنیاد کیا ہے؟ پرویز اُن احادیث کو واقعی تسلیم نہیں کرتے جو قرآن پاک کی تعلیمات کے خلاف ہیں اور جنہیں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے کوئی سی نسبت ہی نہیں۔ ایسی احادیث خلافتِ راشدہ کے بعد بعض ملوکانہ مصلحتوں کے تحت وضع کی گئیں یا عجمی سازش نے اپنے سانچوں میں ڈھال کے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیا۔ ایک مبحث یا مسئلے کو، جو تاریخ اسلام کا عصری مضمون ہے اور نئی پود کے دماغ اُس سے دوچار ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مقتدر علما۔ اپنی یلغار سے اُس کو ٹال نہیں سکتے۔ اور نہ یہ مسئلہ یا مبحث کفر و اسلام سے متعلق ہے۔ نئی پود کی سوجھ کیا ہے؟ پرویز نے اسی کی نمائندگی کی اور اپنی ذہنی جدوجہد سے اسلام کے دامن سے عجمی گرد جھاڑی ہے۔ بعض طبیعتوں کو شاید یہ گوارا نہیں لیکن علم کو غصہ سے روکنا کسی حالت میں بھی جائز نہیں۔

(۶) پرویز صاحب نے اسی باب میں اپنے عقیدے کی وضاحت کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں نہ سُنّی ہوں نہ شیعہ۔ میرا تعلق کسی بھی فرقہ سے نہیں۔ قرآن کریم کا طالب علم ہوں۔ اور میرا عقیدہ بلکہ ایمان یہ ہے کہ خدا کی یہ کتاب عظیم دین میں سند و حجت ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا واحد معیار کوئی عقیدہ، نظریہ، تصور، مسلک، مشرب، جو اس کے خلاف جاتا ہو میرے نزدیک درست نہیں، خواہ اس کی نسبت کسی طرف بھی کیوں نہ کی گئی ہو۔ اگر اس قسم کا کوئی عقیدہ بزرگان سلف میں سے کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے خواہ ان کا تعلق کسی فرقے سے ہو تو ان حضرات کے احترام کے پیش نظر میں یہی کہتا ہوں کہ ان کی طرف اس کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ انہوں نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔ (صفحہ ۴۹)

ان الفاظ کے بعد پرویز کی شرعی چھاڑ لائق اعتنا نہیں رہتی۔ ایک مسلمان کے لئے قرآن کے مقابلہ میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کا مختلف المعنی قول حجت نہیں بلکہ اس سے ابا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

شاہکار رسالت مضمون و موضوع کی عمدگی کے علاوہ کتابت و طباعت کے اعتبار سے بھی ایک اعلیٰ کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ نظر و فکر کی بہت سی راہیں کشادہ کرتا اور اسلام کے مثالی نظام ریاست کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں کہ عمر بھر وہ اس کی آرزو کرتے رہے اس کتاب کو مسلمانوں کی ذہنی سوانح عمری کہا جائے تو صحیح ہوگا!

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف میں

پرویز صاحب سے ہمیں خود کئی دوائر میں اختلاف ہے لیکن اس کتاب کے مطالعہ سے ہمارے ذہن میں ان کے لئے احترام کی ایک خاص فضا پیدا ہوگئی ہے۔ اقبال عجم کے متعلق جو چاہتے تھے شاہکار رسالت اُن کی اسی خواہش کا علمی مرقع اور تاریخی شہ پارہ ہے۔

پرویز کے خلاف فتوے واپس لیجیے

ایڈیٹر چٹان کو آج تک جناب غلام احمد پرویز سے ذاتی نیاز حاصل نہیں ہو سکا کبھی اُن سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن ان کی عظیم کتاب شاہکار رسالتؐ پڑھنے کے بعد ایڈیٹر چٹان کو یقین ہو چکا ہے کہ اپنی اس کتاب کی بدولت پرویز بارگاہِ رسالتؐ میں سرخرو ہو کر باریاب ہوں گے اور یہ کتاب ان کے لئے توشہ آخرت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اُن فضلائے کے ساتھ اُنہیں جگہ دیں گے جن کے دل اسلام کے لئے ہر دور میں دھڑکتے رہے ہیں۔

غلطیاں ہر انسان سے ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے صلحائے اُمت کے نزدیک کسی مقام پر اُن کے قلم کو ٹھوکر لگی ہو۔ آخر وہ ایک انسان ہیں لیکن ان کے سچّا مسلمان ہونے میں کوئی شک نہیں۔ وہ قرآنی فکر کی ایک فاضل شخصیت ہیں۔ علماء سے دردمندانہ گزارش ہے کہ وہ محض فروعات کا شکار نہ ہوں۔ شاہکارِ رسالتؐ کا مطالعہ کریں اور ضرور کریں۔

اُن کی بلندیٔ فکر کے نزدیک پرویز صاحب سے کبھی تفقہ فی الدین میں کوئی چوک ہوئی ہے تو اُنہیں محبت سے مطلع کریں تاکہ ایک سچّا دل اپنی "کوتاہی" کا جائزہ لے سکے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ پرویز بھی افکارِ اسلام کی کربلا میں حسینی قافلہ کی ایک آواز ہیں۔ علماء کو ان سے متعلق اپنا فتوے واپس لینا چاہیے۔

(چٹان مورخہ ۷۴-۵-۱۳)

بقیہ - باب المراسلات (صفحہ ۱۶ سے آگے)

کو دیکھا۔ ان میں چھوٹی چھوٹی سی گمنام انجمنوں کی طرف سے منعقد کردہ یوم اقبالؒ کی تقریبات کی روئیدادیں نظر آئیں۔ لیکن آپ کے اس اجتماع کی روئیداد تو ایک طرف، خبر کے طور پر دو سطریں بھی کسی اخبار میں دکھائی نہ دیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

طلوعِ اسلام

اس کی وجہ آپ ان اخبارات سے دریافت فرمائیے۔ ہم کیا عرض کر سکتے ہیں۔

۲۔ باقی رہا آپ کا ہدیۂ تبریک، سو اس کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ پرویز صاحب کا درس قرآن مجید ہر اتوار کی صبح ان کے مکان واقعہ ۲۵/بی گلبرگ ۲ میں ہوتا ہے۔ اگر آپ اس میں شرکت کر سکیں۔ تو آپ اسے بہت مفید پائیں گے۔

خدا پر ایمان

مذہب کی بنیاد ہے۔ اس لئے (ماسوائے دہریوں کے) ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں خدا کو ضرور مانتا ہے۔

- لیکن ہر شخص کا خدا کا تصوّر الگ الگ ہوتا ہے حتیٰ کہ مختلف مذاہب میں بھی خدا کا تصوّر مختلف ہے۔
- قرآن مجید نے خدا کا تصور بڑی شرح و بسط سے دیا ہے، اور وہ خدا کے ماننے والوں سے بھی، خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔
- قرآن مجید نے خدا کا تصوّر کس قسم کا دیا ہے، اور خدا اور بندے کا تعلق کیا ہے، یہ سوال بڑا اہم ہے۔
- اس سوال کا جواب، مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے اپنی سب سے پہلی تصنیف

"من و یزداں"

میں بڑی تفصیل سے دیا ہے۔

- یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی لیکن کچھ عرصہ سے نایاب تھی۔
- اس گرانی کے زمانے میں ایسی ضخیم اور وقیع کتابوں کا شائع کرنا، اور وہ بھی ادارہ طلوع اسلام کے روایتی معیار کے مطابق، ہمت طلب مرحلہ ہے۔
- لیکن ادارہ نے کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ طے کر لیا، اور اب یہ کتاب، مصنف کی نظر ثانی کے بعد چھپ کر آگئی ہے۔
- بڑا سائز۔ ضخامت چار سو صفحات سے زائد۔ وہائٹ پرنٹنگ پیپر۔ پائدار جلد۔ نظر نواز گرد پوش۔ قیمت -/۲۵ روپے۔ محصول ڈاک -/۲ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور + (۲) مکتبہ دین و دانش، اُردو چوک۔ لاہور

طلوع اسلام کنونشن ۔ نومبر ۱۹۷۳ء

مجلس مذاکرہ

عنوان ۔ نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے

(قسط دوم)

راحیل اکبر

صدر محترم اور قابلِ قدر سامعین! السلام علیکم۔

میں اگرچہ اس سٹیج پر پہلی مرتبہ حاضر ہو رہا ہوں لیکن ادارے کی تحریک اور لٹریچر میرے لئے نیا نہیں۔ آج کے مذاکرے کا عنوان ہے" نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے"۔ میں اس موضوع کی حمایت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

محترم صدر صاحب و معزز حاضرین کرام (خواتین و حضرات)! میں اپنی گفتگو کا آغاز ایک چھوٹی سی مثال سے کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اگر مریض ایک ڈاکٹر کے پاس آئے اور ڈاکٹر اس کا معائنہ کیے بغیر ہی کہہ دے کہ تمہارا مرض لاعلاج ہے میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اس کی حالتِ زار سے مایوس ہے بلکہ وہ جان بوجھ کر اس کا علاج کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر وہ مریض کا تمام موجود آلات کی مدد سے مکمل معائنہ کرے اور علاج کرے اور اس کے بعد مایوسی کا اظہار کرے تو اس کو اختیار ہے۔ کیونکہ اس کے پاس اور کوئی راستہ باقی نہیں اور وہ بے بس ہے۔

اس مثال کو سامنے رکھئے اگر آپ پاکستان کے مسائل کو مریض اور پاکستانی عوام کو ڈاکٹر سمجھ لیں جو مریض کا جان بوجھ کر علاج کرنا نہیں چاہتا تھا تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہمارے عوام جن مسائل و مشکلات سے دوچار ہیں ان کا حل تو موجود ہے لیکن وہ ان کو بذاتِ خود حل کرنا نہیں جانتے اور چاہتے ہیں کہ کوئی اور آئے، کوئی نجات دہندہ اُن کو ان مصائب سے نجات دلائے ایک طرف وہ اس مسیحا کے انتظار میں

کراچی میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات
حاصل کرنے کے لئے دفتر بزم طلوع اسلام سے رابطہ قائم کریں۔
پتہ:۔ دار القائد - 20 - I - B - III ناظم آباد - کراچی 18

ہیں۔ اور دوسری طرف پاکستان (جس کی سرحدوں میں لاکھوں شہیدوں کا خون اور بابائے قوم کی انتھک محنت شامل ہے) آج دو حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے ایک بازو پر ہندو جیسی مکار قوم کی حکمرانی ہے اور دوسرے بازو پر انتشار اور گراں فروشوں کی حکمرانی ہے۔ یہ دیس عظیم راہ نما محمد علی جناح کی بے وقت موت کے بعد سے خود غرض سیاست دانوں، بڑی طاقتوں کے مہروں یا فوجی لوگوں کے ہاتھوں کھلونا بنا رہا۔ اس کے حکمرانوں کے ذہن میں وہ مقصد واضح نہیں تھا جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ ان کے نزدیک ہندوستان و پاکستان کی تفریق بالوں کی مانگ کی حیثیت رکھتی ہے جس نے ایک ہی سر کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ان کے نزدیک قومیت کا معیار "زمین اور کلچر کا اشتراک ہے" نہ کہ "مذہب کا اشتراک" اور چونکہ جدید کلچر یعنی ڈرامہ رقص موسیقی و مصوری برصغیر میں مشترک ہیں اس لئے وہ سوچتے ہیں کہ پاکستان کو ہندوستان سے علیحدہ ایک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان تخریب کا شکار ہو گیا۔ عوام مسلسل مصائب و تکالیف برداشت کرتے کرتے بے حس اور مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔

لوگ نہ صرف پاکستان سے بلکہ اسلام سے بھی مایوس ہوتے جا رہے ہیں جو کہ اس نظریاتی مملکت کے وجود میں آنے کی بنیاد تھا۔ اسلام کے پانچوں بنیادی ارکان کی سبھی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں۔ زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ اور حج کرتے ہیں لیکن نتیجہ پھر بھی ویسا نہیں ہوتا جیسا رسولِ پاک کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ وہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ اسلام زمانے کے تیزی سے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

لیکن ٹھہریئے۔ کیا اسلام ہمیں مایوس ہونے کی اجازت دیتا ہے! ہرگز نہیں۔ ہمارے مسلک میں تو مایوسی کفر و گناہ ہے۔ علم و عرفان کا زوال ہے توہین ہے۔ قوموں پر مصیبتیں آیا ہی کرتی ہے لیکن تاریخ گواہ ہے۔ زندہ قومیں خدا سے مایوس و نا امید نہیں ہوتیں بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہیں۔ دشواریوں کے سیلاب کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتیں اور نہ ہی ان کے تیز دھارے میں بہہ جاتیں ہیں بلکہ ان مشکلات کی بھٹی میں سے کندن بن کر نکلتی ہیں۔

خواتین و حضرات! علم و عقل کی رُو سے مایوسی تو اُس وقت ہونی چاہیئے جب ہم تمام دروازے آزما چکے ہوں اور ان سب دروازوں سے ناکام لوٹے ہوں۔ لیکن خدا جہاں ایک دروازہ بند کرتا ہے وہاں دس دروازے اور کھول دیتا ہے۔ پھر اس میں مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

ہمیں پاکستان سے مایوس ہونے کی ضرورت اس لئے نہیں کیونکہ "قائداعظم کے تصور کا پاکستان" قائم کیا جا سکتا ہے اور

اسلام سے مایوس ہونے کی ضرورت اس لئے نہیں کیونکہ "تہوار، معجزات و رسومات کا مرکب اسلام" جو ہمارے مولانا پیش کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت دین سے ہی نہیں۔ بلکہ یہ تو اُن علماء کا خود ساختہ نظام ہے جس سے وہ اپنے نان و نفقہ کا انتظام کرتے ہیں۔ اگر ہم نوجوان نسل کو عربی سکھائیں اور انہیں

خود قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کے قابل بنائیں تو ہمیں کہانیاں سنانے والے مولاناؤں کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور اس طرح قرآن کے زریں اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ہم ایک مرتبہ پھر دنیا پر اسلام کی حکمرانی قائم کر سکیں گے۔

محترم صدر صاحب! ہم میں سے بعض لوگ نئی نسل اور خصوصاً طالب علموں سے مایوس ہیں۔ وہ ان شاہینوں کو آوارہ اور غیر ذمہ دار سمجھتے ہیں اور ان کی تن آسانی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ ان لوگوں سے میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے بزرگو! ہم سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نوجوان تو کمہار کی مٹی یا کچی ہوئی دھات ہیں جنہیں جس سانچے میں ڈھالنا چاہیں ڈھال لیں۔ ان ہی کے متعلق شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا ارشاد ہے۔

نہیں ہے نا اُمید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

آخر میں میں محترم بابا جی سے سوال عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان حالات میں جب کہ ہمیں کسی نجات دہندہ کا انتظار بھی نہیں کرنا اور پاکستان اور اسلام سے مایوس ہونا بھی زوال علم و عرفان ہے تو پھر ہمیں مایوسی کے ان کالے بادلوں کو دور کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

جہاں تک نوجوانوں کا تعلق ہے تو میں اس سلسلے میں دوبارہ یہ کہوں گا کہ ان سے مایوس نہ ہوں۔ تو م کا نوجوان طبقہ بے عمل نہیں وہ صحیح راہ نمائی کا محتاج و متلاشی ہے۔ محترم بابا جی!

اے رہبرِ فرزانہ! مایوس نہ ہو ان سے
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

---

(۵)

ثریا عندلیب

صدرِ گرامی قدر و سامعین کرام! السلام و رحمت

موجودہ دور میں انسانی زندگی کو جن سنگین حالات کا سامنا ہے۔ وہ کسی بھی نگہ بینا سے پوشیدہ نہیں۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسانوں کو بحیثیت مجموعی مختلف گھٹنائیوں سے گزرنا پڑتا ہے اور کم و بیش پوری انسانیت جاں سوز کرب و اضطراب میں مبتلا ہے لیکن اس کیفیت کے باوجود زندہ و بیدار قوموں کے افراد کو دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ یہ ایسی ہمہ مشکلات و موانعات وہ کبھی کسی موقع پر دل شکستہ و سرنگوں نہیں ہوتے اور شب و روز تلخ ترین حقائق سے دوچار رہنے پر بھی دامن ہمت ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ وہ زندہ و تابندہ رہنے کی خاطر درخشاں مستقبل کے حصول کے لئے ہر دم تر و تازہ مسلسل تگ و تاز میں مصروفِ کار رہ کر بالآخر راستے کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کی بین مثالیں اقصائے مشرق و مغرب سے دی جا سکتی ہیں۔ اس کے برعکس آج ہمارے ہاں معاشرے کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ یہاں ہر فرد مایوس ذہن اور محزون قلب لئے جی نہیں رہا بلکہ زندگی کے سانس گن رہا ہے۔

یہاں ہر کسی کی بددلی کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ خواہ کوئی تعلیم یافتہ ہو یا اَن پڑھ، ہر ایک کے لبوں پر ہر ساعت یہی بول رہتے ہیں ـــ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں بھئی اب کیا ہو سکتا ہے؟ ہم تو ختم ہو گئے۔ لٹ چکے پٹ گئے۔ اب ہمارا کیا باقی رہ گیا ہے جو ہم آئندہ کسی بہتری کی توقع رکھیں۔ فضا میں سکیموں کی بھنبھناہٹ کی طرح چاروں طرف یہ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ دیکھتے نہیں ہو اپنی تباہی و بربادی کو۔ بھلا اب کیا ہو سکتا ہے۔ کچھ نہیں۔ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم اس حد تک جا پہنچے ہیں جہاں سے پلٹا نہیں جا سکتا۔ گویا ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اس تیرہ بختی کی گرفت سے نکلنا ہمارا مقدر نہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف ہماری یہ دوں ہمتی و کم نظری اور دوسری طرف ہمارا اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے پر مُصر رہنا۔ آخر ایں چہ بوالعجبی است؟ کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟؟

مسلمان کی تو پہچان یہ ہے کہ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا کیونکہ اس کو ایسی ازلی و ابدی مکمل و محفوظ رہنمائی حاصل ہے کہ اس کی پیروی کرتے ہوئے وہ کبھی مایوس و ناامید نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مفکرِ اسلام حکیم الامت و ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ نے فرمایا تھا کہ ـــ "نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے۔" اس موضوع کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ ہمارے آج کے مذاکرے میں اسی عنوان کے تحت بات چیت کی جائے۔ چنانچہ اس تعقلِ قرآنی میں ہمیں دلائل و براہین سے یہ ثابت کرنا ہے کہ ناامیدی حقیقتہً و یقیناً علم و عرفان کے زوال کا باعث بنتی ہے اور انسانیت کو سرفرازی و کامرانی سے محروم رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں علم و بصیرت کی رُو سے اس صداقت کو جاننے اور ماننے کے لئے ہمیں اسی واحد ضابطۂ حیات کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو خدائے واحد کی طرف سے تمام عالمِ انسانیت کی ہدایت و رہبری کے لئے نازل ہوا ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ مایوسی و ناامیدی کس کو ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے؟ اس اہم سوال کا لاریب جواب ہمیں قرآن کریم کی اس آیہ جلیلہ میں ملتا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ جو لوگ نہ ہمارے قانونِ نشو و نما پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں اس کا یقین ہے کہ انہیں قانونِ مکافات کا سامنا کرنا ہے وہ اپنی من مانی کرتے ہیں اور اپنے عمل کے نتیجہ میں مایوسی کا سامنا کرتے ہیں کیونکہ وہ اس سامانِ نشو و نما سے محروم رہ جاتے ہیں، جو ہمارے تجویز کردہ راستے پر چلنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان کی اس حرماں نصیبی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تمام انسانی صلاحیتیں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں اور یوں ان کا انجام بڑا ہی الم انگیز ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ کے اس اٹل فرمان سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مایوسی کفر کا دوسرا نام ہے اور مایوس وہی ہوتا ہے جو قوانینِ خداوندی سے منہ موڑ کر اپنے ذہن کے تراشیدہ بتوں کو پوجتا ہے اور اپنے سفلی جذبات کے غلط راستوں پر چل کر ٹھوکریں کھاتا ہے۔ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ۔ جو خدا کا راستہ چھوڑ کر غلط راستوں پر چل نکلیں وہی اس کی رحمت سے ناامید ہوتے ہیں اور ناامید ہو جانے والوں کی

کیفیت قلبی یہ ہوتی ہے کہ ان کے لئے چمکتے دن اندھیری راتوں میں بدل جاتے ہیں۔ یہ نا اُمیدی انہیں بیخ و بن سے اکھیڑ کر رکھ دیتی ہے کیونکہ جب نا اُمیدی پیدا ہو تو ناتوانی اس کے ساتھ لازم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے کوئی فرد اپنے قدموں پر جسم کر کھڑا نہیں رہ سکتا وہ ادھر ادھر ڈولتا اور لڑکھڑاتا رہتا ہے۔ ایسے نا امید افراد پر مشتمل قوم کے اندر سے اس کی ساری قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ وہ ذہنی طور پر بالکل مفلوج ہو جاتی ہے مایوسی کے جال میں پھنس کر اس کے دل و دماغ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں جامد ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہیں۔ وہ بظاہر زندہ ہوتی ہے لیکن حقیقت میں مردوں سے بدتر کہ نا اُمیدی تو مثل آکاس بیل کے ہے جو نخلِ حیات کے گرد لپٹ کر اس کی تمام تازگی، شادابی و شگفتگی چوس لیتی ہے۔ اس کے بعد کھوکھلے تنے کے سوا کیا باقی رہ جاتا ہے؟ اور اس حقیقت مسلمہ سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ علم و عرفان سے بہرہ مند ہونے کے لئے ذہن رسا اور قلب مصفا کی ضرورت ہوتی ہے۔ برعکس اس کے جب مایوس انسان کی ذہنی قوتیں بے کار رہیں اور اس کی خفتہ صلاحیتیں بیدار نہ ہوں تو وہ کیونکر علم و عرفان کے اوج و کمال تک پہنچ سکتا ہے؟ بدیہی طور پر اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ نا اُمیدی علم و عرفان کے زوال کا باعث بنتی ہے اور علم و عرفان کا زوال لازماً انسانیت کو ذلت و خواری سے دوچار کرتا ہے اور سرفرازی و سربلندی سے ہمکنار ہونے نہیں دیتا۔

آج جو ہمارے معاشرے میں اس قدر مایوسی پھیل چکی ہے کہ کوئی ایک شخص بھی کسی قسم کی امید کی نوید دینے والا نہیں ملتا۔ اس کا سبب کیا ہے؟ کیا ہم نے کبھی صدق دل اور خلوص نیت سے فرداً فرداً یا مل بیٹھ کر یہ سوچنے کی ضرورت سمجھی کہ آخر ہم نے اپنے اذہان و قلوب پر یہ ابلیسیت کیوں طاری کر رکھی ہے؟ ہم جو خدا اور اس کے رسولؐ کے نام لیوا بنتے ہیں کیوں ابلیسیت و شیطانیت کے پھندے میں گرفتار ہیں؟ قرآن حکیم کی رُو سے لفظ ابلیس انتہائی مایوسی کا مظہر ہے اور مایوسی کی انتہا یہی ہے جب آدمی یہ کہنا شروع کر دے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ابلیس کا سب سے بڑا حربہ یہ ہے کہ وہ اپنے حریف انسان پر مایوسی طاری کر دیتا ہے۔ وہ خود ابدی مایوس ہے اور مایوسی پھیلانا اس کا مؤثر حربہ۔ یہ یاس و نا اُمیدی ہی وہ بڑی ابلیسیت ہے جس کا مقابلہ انسان کو کرنا ہے چہ جائیکہ مسلمان یعنی مومن اس کے مقابل ہو۔ جو خدائے عزوجل کی اس زندہ و پائندہ کتاب پر ایمان رکھتا ہے جو مایوسیوں کو امیدوں میں بدل دینے والی کتاب ہے جو انسانوں کو تاریکیوں سے نکال کر سلامتی کے روشن راستے دکھاتی ہے اور جب راستے روشن ہو جائیں تو اس کے بعد مایوسی کیسی؟ اور ایسی کتاب پر ایمان لانے والا کیونکر یہ کہہ سکتا ہے کہ آس و امید کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔ اگر قرآن کریم پر ایمان رکھنے والی قوم بھی یہ کہہ دے کہ کچھ نہیں ہو سکتا تو حتمی طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ وہ قوم قرآن کو ماننے والی نہیں ہو سکتی جس کے سامنے خدا کی کتاب زندہ ہوتی ہے وہ زندگی کی طرف سے کبھی مایوس نہیں ہوتا حقیقت یہ ہے کہ زندگی نام ہی امید و آرزو کا ہے۔ جب تک کسی سینہ میں آرزو کی کرن موجود ہے، زندگی کی رمق باقی ہے۔ ورنہ آرزوؤں کے فنا ہو جانے کا نام تو موت ہے۔ زندہ رہنے کی امید اور آگے بڑھنے کی آرزو وہی ہے جس سے انسان

کی خودی میں ارتعاش اور اس کے جوہرِ خفتہ میں بیداری پیدا ہوتی ہے۔ اسرارِ خودی میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:۔

زندگانی را بقا از مدعا است ۔ کاروانش را درا از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است ۔ اصلِ اُو در آرزو پوشیدہ است
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست ۔ فطرتِ ہر شے امینِ آرزو است

زندگی یہ ہے کہ انسان کے سامنے ایک درخشندہ نصب العین ہو اور اُس نصب العین کے حصول کی تڑپ برقِ تپاں کی صورت میں اس کے رگ و پے میں جاری و ساری رہے۔ کائنات کی تمام رنگینیاں نقطۂ آرزو کے اندر پوشیدہ ہیں۔ سفرِ حیات میں جہاں یاس و ناامیدی نے غلبہ پایا، انسان پر عملاً موت طاری ہو گئی۔ ابلیس کا سب سے بڑا مشن یہ ہے کہ انسان یاس و ناامیدی کے چکر میں گھومتا رہے۔ اس کے جنود و عساکر یعنی انواع و اقسام کے شیاطین ایسے اسباب پیدا کرتے رہتے ہیں جن سے اس پر خوف مسلط ہو جاتا ہے اس کے حوصلے پست اور ولولے سرد پڑ جاتے ہیں۔ اس پر خوف و حزن طاری ہو جاتا ہے اور یہ جی چھوڑ کر کشمکشِ حیات سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ مایوسیوں کی ان ظلمت خیز گھٹاؤں میں انسان یا تو چپ چاپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی گوشۂ تنگ و تاریک میں سر بزانو بیٹھ جاتا ہے اور یا بعض اوقات شدتِ یاس و غم سے مغلوب ہو کر تخریب پر اتر آتا ہے اور اپنے مقاصد کی جس قدر عمارت برسوں کے پسینہ اور خون سے بہزار مشقت تیار کی تھی اسے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ پھوڑ کر خاک میں ملا دیتا ہے کسی گوشۂ تیرہ و تار میں سر بزیری ہو یا اس قسم کی حرکتِ مذبوحی، بہرحال دونوں شدتِ یاس اور فرطِ ناامیدی کے مظاہر ہیں جو آج ہمارے معاشرے کے جزوِ زندگی بن چکے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب ابلیس اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر انسان پر ہنستا ہے۔ یعنی ہمارا تمسخر اڑاتا ہے اور ہم پر قہقہے لگا رہا ہے لیکن مایوسیوں کی اس تاریکی میں اگر کہیں سے شعاعِ امید نظر آ سکتی ہے تو وہ ایمان کی شمع فروزاں ہے جو ان بھیانک اور سیاہ بادلوں میں جگمگاتے نقرئی حروف میں لکھ دیتی ہے کہ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ اور دیکھو نہ تو ہمت ہارو اور نہ غمگین ہو تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو بشرطیکہ تم سچے مومن ہو۔ یعنی یہ کہ اگر کسی وقت حالات ناسازگار ہو جائیں تو اس سے تم پر افسردگی نہیں چھا جانی چاہیئے۔ مگر یہ اُسی صورت میں ممکن ہو گا جب تمہیں قوانینِ خداوندی کی صداقت پر پورا پورا یقین ہو۔ جب تم مومن ہو تو حزن و خوف کاہے کا۔ جب تک تم اس راہِ خدا پر گامزن رہو گے تم پر کوئی غالب نہیں آ سکے گا۔ یہی وہ شمعِ تابندہ تھی جس کا وعدہ روزِ ازل سے آدم سے کیا گیا تھا جب اُس سے کہہ دیا گیا کہ دنیا میں جاؤ اور پوری قوت سے ابلیس کی چالوں کا جواب دو۔ یاد رکھو! تم تنہا نہیں ہو۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ خوف شیاطین کے لشکروں سے اور حزن اپنی امیدوں کی موت سے۔ دونوں ایمان کی کمزوری کی دلیل اور ضعفِ خودی کا ثبوت ہیں۔ ایمان کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ

خوف اور حزن پاس نہ پھٹکنے پائیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق ابلیس سے کہہ دیا گیا تھا کہ جاؤ اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لو اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ۔ میرے بندوں پر تیرا قبضہ نہیں ہو سکیگا۔ جو لوگ میرے قوانین کے مطابق چلیں گے ان پر تیرا کوئی زور نہیں چل سکیگا۔

میرے قرآنی بہن بھائیو اور بزرگان عظام! ذرا تصور میں لائیے وہ وقت جبکہ مخالفتوں کے ہجوم نے حضور رسالتمآب کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ آپ گھر بار چھوڑ کر ایک ویرانے پہاڑ کے مہیب غار میں چھپے بیٹھے ہیں۔ تعاقب کرنے والوں کے گھوڑوں کی ٹاپ کی آوازیں کانوں میں آرہی ہیں۔ دشمن اپنے پورے سامانِ ہلاکت کے ساتھ قریب سے قریب تر ہوتے چلے آرہے ہیں۔ یہ بالکل بے ساز و سامان دشمن کی مین زد میں آچکے ہیں۔ بظاہر حفاظت کا کوئی سامان اور مدافعت کا کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ گویا ابلیس کا پورا لشکر اپنی ساری قوتوں کے ساتھ طوفانِ بلا کی طرح امڈے چلا آرہا ہے۔ اس خوف دہر اس کے وقت ایک دوست دوسرے کی پیشانی پر کچھ تردد کے آثار محسوس کرتا ہے۔ اس کا یہ تردد اپنی خاطر نہیں بلکہ اس ذاتِ اقدس و اعظم کی خاطر ہے جو دنیا کی ہر شے سے محبوب ہے کہ ایسے میں ایمان کی پوری قوتوں کے ساتھ زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ایک دنیا جلو میں لئے اس رفیق مشفق کے قلب مطمئنہ سے یہ جان بخش آواز ابھرتی ہے۔ کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ سبحان اللہ تعالے۔

ستاروں کی طرح دمکتے اس واقعہ میں کیا ہمارے لئے یہ ان مٹ سبق پوشیدہ نہیں کہ جس کے سینے میں قرآن کا چراغ روشن ہو مایوسی کی ظلمت کبھی اس کے پاس نہیں پھٹک سکتی۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ قرآن ہمارے گھروں میں موجود ہماری زبانوں پر موجود اور ہمارے سینوں میں موجود ہے اس کے باوجود ہمیں امید کا مستقیم راستہ نظر نہیں آتا۔ قرآن کہتا ہے کہ اس راستے میں کچھ رہزن کھڑے ہوں گے جو راستہ روک دیں گے۔ قرآن ان رہزنوں کو فرعونیت قارونیت اور مذہبی پیشوائیت کا نام دیتا ہے۔ ہماری دوں ہمتی و بدبختی یہی ہے کہ ہم نہ صرف ان دیواروں کو ہٹانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ان شیطانی قوتوں کے سامنے بےبس ہو جاتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ نا اُمیدی بے بسی کے بطن سے جنم لیتی ہے جبکہ قرآن کے نزدیک کسی سچے مسلمان کا بےبسی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا وہ بتاتا ہے کہ شیطانی وساوس کے جنگل سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ خدا کی عطا کردہ ہدایت وحکمت کی صداقت پر یقین کامل رکھا جائے تو پھر کوئی قوت سدِ راہ نہیں ہو سکتی۔ اللہ تبارک و تعالےٰ کا فرمان ہے کہ ہماری یہ کتاب رحمت اور منزل تک پہنچانے کی خوشخبری دینے والی اور راستہ دکھانے والی کتاب ہے اس لئے ہماری رحمت سے نا اُمید نہ ہو۔ قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ۔ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔ جو لوگ ہمارے قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ان کے لئے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ان کے جو حالات ہمارے قوانین کے خلاف چلنے سے بگڑ گئے ہیں۔ وہ ہمارے قانون کے مطابق چلنے سے پھر سے سنور سکتے ہیں۔ یہ قانون ایسا ہے کہ اس کے اتباع سے سابقہ لغزشوں کے پیدا شدہ نقصانات کی تلافی بھی ہو جاتی ہے اور مزید نشوونما کا سامان بھی مل جاتا

ہے۔ اور اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے کہ بس تم خدا کے قانون کی طرف رجوع کرو اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو۔ لیکن اس میں دیر مت کرو۔ اس لئے کہ جب یہ مہلت کا وقفہ ختم ہو گیا اور ظہورِ نتائج کا وقت آ گیا تو پھر تمہیں اس تباہی سے بچانے والا کوئی نہیں ہو گا۔"

حاضرین عزیز! آپ نے دیکھا کہ قرآنِ حکیم کی تعلیم میں ہماری حفاظت کے کتنے سامان ہیں۔ یہ لافانی تعلیم ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کسی جرم کے ارتکاب سے ابدی طور پر زندگی کی خوشگواریوں سے محروم نہیں ہو جاتا وہ جب بھی قانونِ خداوندی کو اختیار کرے گا۔ اس قانون کے خوشگوار نتائج اس کی طرف لپک کر آ جائیں گے۔ یعنی ہر شخص کے لئے بازآفرینی کا امکان موجود ہوتا ہے لیکن یہ اسی وقت تک ممکن ہے جب انسان کے لئے عملِ صالح کرنے کا امکان ہو۔ جب عمل کا موقع ختم ہو جائے تو پھر بازآفرینی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اعمالِ حسنہ میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ غلط اعمال کے نقصان رساں نتائج کا ازالہ کر دیں۔ جب آپ نے اپنی غلطی کے احساس و اعتراف کے بعد مایوسی و شکستہ خاطری کے غلط و تاریک راستے کو چھوڑ دیا اور روشن و صحیح راستہ کی طرف رُخ کیا تو صحیح راستے نے بھی جو اس وقت تک آپ سے منہ موڑے ہوئے تھا آپ کی طرف رُخ کر لیا۔ رُخ ہی نہیں کر لیا بلکہ آپ نے اس کی طرف ایک قدم اٹھایا تو وہ دو قدم اٹھا کر آپ کی طرف بڑھ آیا۔ دو قدم اس طرح کہ ایک قدم وہ کم ہوا جو آپ پہلے مخالف سمت میں جاتے وقت اٹھا رہے تھے اور دوسرا قدم وہ جو آپ نے اس کی طرف اٹھایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب انسان غیر خدائی قانون کو چھوڑ کر قانونِ خداوندی کی طرف رُخ کرتا ہے تو یہ قانون اپنے تمام خوشگوار نتائج کو لئے ہوئے اس انسان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ انسان کے صحیح و بلند کردار کی انتہا یہ ہے کہ وہ متوازن ہو جائے۔ آج ہماری آہ و فریاد اسی بات پر ہے کہ ہمارا معاشرہ متوازن نہیں رہا۔ اور خدا کہتا ہے کہ کاروانِ انسانیت کو سفرِ زندگی میں وہ راہ دکھاتا ہے جس سے زیادہ توازن بدوش اور سیدھی راہ اور کوئی نہیں۔ اور ان لوگوں کو جو اس کی صداقتوں کو تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کے متعین کردہ پروگرام پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں، خوشخبری دیتا ہے کہ انہیں ان کے حسینِ عمل کا بہت بڑا اجر ملے گا اور وہ توازن بدوش راستے پر رواں دواں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ شاعر کہتا ہے۔

> رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
> صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

بات بھی سچ ہے۔ اگر ہم مومن ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے قرآن کریم کے ابدی حقائق تابندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتے دنیا کے سامنے لے آئیں اور خدا کا متعین کردہ نظام دنیا میں عملاً متشکل کرنے میں اپنا فرض پورا کر دیں تو جن تاریکیوں میں الجھ کر نوعِ انسانی راہ گم کر چکی ہے وہ تاریکیاں چھٹ جائیں اور خدا کے وعدے کے مطابق جنت سے نکلے ہوئے آدم کو پھر سے جنت میں جانے کی کہکشانی صراطِ مستقیم مل جائے۔

ہمیں قرآنی فکر کو ان لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے جو زندگی کے عملی مسائل پر غور و فکر

کرنے اور علم وبصیرت کی رُو سے انسانیت کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے متمنی اور آرزومند ہوں۔ قرآن کا خطاب ہی ان لوگوں سے ہے جن میں زندگی کی کچھ رمق اور حرارت ہے۔ لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا۔ یہی وہ زمین ہے جس میں اس فکر کا تخم صالح شجرِ طیب بن کر پھولتا اور پھلتا ہے۔ اور انہی کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ

نہیں ہے نا اُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

آئیے آج ہم سب مل کر اپنی قوم کو یہ نعرہ دیں کہ ـــ نہ ہو نومیدؔ نومیدی زوالِ علم وعرفاں ہے۔ اور اس نعرہ کو فضا میں عام کر دیں۔ اگر ہم پورے عزم و ثبات کے ساتھ یہ کہنا شروع کر دیں کہ ناامیدی کوئی شے نہیں اور ہم سب کچھ کر سکتے ہیں تو ہمارے لئے سوچ کے ہزاروں دروازے کھل جائیں گے۔ آگے بڑھیئے کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر کچھ نہیں کی بجائے کچھ ہاں کریں۔

زمانے کی یہ گردش جاودانہ ∴ حقیقت ایک تو باقی فسانہ

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

(باقی - باقی)

ـــــ (۲۲۲) ـــــ

محترم پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور میں ہر اتوار - صبح ۸ بجے بمقام ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور ٹیلیفون ۸۰۸۰۰	**لائلپور** میں بروز جمعہ - (بذریعہ ٹیپ) ۳½ بجے بعد نماز جمعہ بمقام : دفتر بزم طلوع اسلام راجہ چوک - ریل بازار - لائلپور رابطہ کے لئے - ٹیلیفون ۴۹۴۲	**ملتان** میں بروز جمعہ - (بذریعہ ٹیپ) بعد نماز جمعہ بمقام : دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ - ملتان ٹیلیفون ۲۰۷۱
... میں ہر اتوار ... (بذریعہ ٹیپ) بمقام : چیدہ ... ...ی شال کرسچن ٹاؤن ... دٹ ۲	**کراچی** میں ہر اتوار - صبح ۹½ بجے - (بذریعہ ٹیپ) بمقام : دفتر بزم طلوع اسلام - دالقائد $\frac{B}{1\text{-}20}$ بس سٹاپ ۷ - ناظم آباد III - کراچی ۱۸	
کوئٹہ میں ہر اتوار - ۳½ بجے بعد دوپہر (بذریعہ ٹیپ) بمقام : ۳ گوردت سنگھ روڈ فون ۲۰۷۰۰ - کوئٹہ	**راولپنڈی** میں ہر جمعہ : ۴ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ) بمقام : جی ۱۴۶ - لیاقت روڈ - راولپنڈی	**واہ** میں ہر جمعہ - بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بمقام - ۱۵ - جہلم روڈ واہ (WAH)

گذارش احوال واقعی :۔

جس کاغذ پر عام جرائد اور رسائل (مع طلوع اسلام) چھپتے ہیں۔ اس کا کنٹرول حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس کے لئے اس کی طرف سے کوٹہ مقرر کیا جاتا ہے۔ جب کنٹرول کے احکام نافذ ہوئے تو قاعدہ کی رُو سے طلوع اسلام نے بھی اپنا حساب شمار چیک کرایا (طلوع اسلام تو حساب کتاب کے سلسلہ میں ایک پرچہ کی کمی بیشی بھی جرم ہی نہیں، گناہ سمجھتا ہے)۔ ارباب اقتدار نے، کسی اپنے معیار کے مطابق، جس قدر کاغذ کا کوٹہ منظور کیا اس میں طلوع اسلام کی مطلوبہ تعداد کسی صورت میں چھپ نہیں سکتی تھی۔ ہم نے ناچار فیصلہ کیا کہ پرچہ کی ضخامت ۸۰ صفحات سے کم کرکے ۶۴ صفحات کردی جائے لیکن اس طرح پرچہ کی افادی حیثیت میں جو کمی واقع ہوئی۔ اس کے ازالہ کے لئے اس کے صفحہ کی سطریں بڑھا دی گئیں۔

ارباب حکومت کی طرف سے ایک ضرب اور لگی اور اس کا کوٹہ ۷۲ فی صد کردیا۔ یعنی کاغذ کی مطلوبہ مقدار کا ۷۲ فیصد کوٹہ سے لیا جائے اور ۲۸ فیصد بازار سے خرید لیا جائے۔ کوٹہ کا کاغذ حکومت کے مقرر کردہ نرخ پر ملتا ہے اور بقایا (جو بازار کی کھلی مارکیٹ سے خریدا جاتا ہے) اس سے ڈیوڑھی اور بعض اوقات دگنی قیمت پر۔ اس مقام پر ہمیں بادلِ ناخواستہ طلوع اسلام کی قیمت میں اضافہ کرنا پڑا۔

اب حکومت کی طرف سے ایک اور وار ہوا ہے اور کوٹہ گھٹا کر ۵۴ فیصد کردیا گیا ہے یعنی اب ہمیں کاغذ کی مطلوبہ مقدار کا ۴۶ فیصد حصہ بازاری قیمت پر خریدنا پڑیگا۔ اس کے ساتھ ہی (کوٹہ کے) کاغذ کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے ۴/- روپے ریم سے، ۳۹/۵۰ روپے ریم ہوئی۔ اب ۳۹/۵۰ روپے سے ۵۳/- روپے فی ریم مقرر کردی گئی۔ جو کاغذ مارکیٹ سے خریدنا ہوگا، اس کی قیمت بھی اس نسبت سے زیادہ ہوگی۔ یعنی قریب ۷۰/- روپے فی ریم۔

طلوع اسلام ایک مشنری ادارہ ہے جس کے لٹریچر کا خاصا حصہ تبلیغاً تقسیم ہوتا ہے۔ اس ادارہ کو نہ کہیں سے مالی امداد ملتی ہے نہ سرکاری اشتہارات۔ ان حالات میں ہم نہیں سمجھتے کہ اگر کاغذ ملنے کا انداز یہی رہا تو ہماری کوتاہ دامنی کس حد تک اس کا ساتھ دے سکے گی۔ ہم نے یہ گذارشِ احوال واقعی اس لئے ضروری سمجھی ہے کہ طلوع اسلام کی قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے احباب کے علم میں ہو کہ ہم کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان احباب کو بھی اس مشن سے اتنا ہی گہرا تعلق ہے جتنا ہمیں۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دکان
سٹینڈرڈ آٹو موبائلز پر تشریف لائیے!
سپیشلسٹ: ڈاج۔ بیڈ فورڈ۔ لی لینڈ۔ بی۔ ایل۔ ایم۔ سی ڈیلرز: موٹر پارٹس ٹرک ڈیزل پارٹس
۱۳۵۔ بادامی باغ۔ ٹیلیفون (۶۹۰۱۲) لاہور